قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

جولائی 2016ء

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

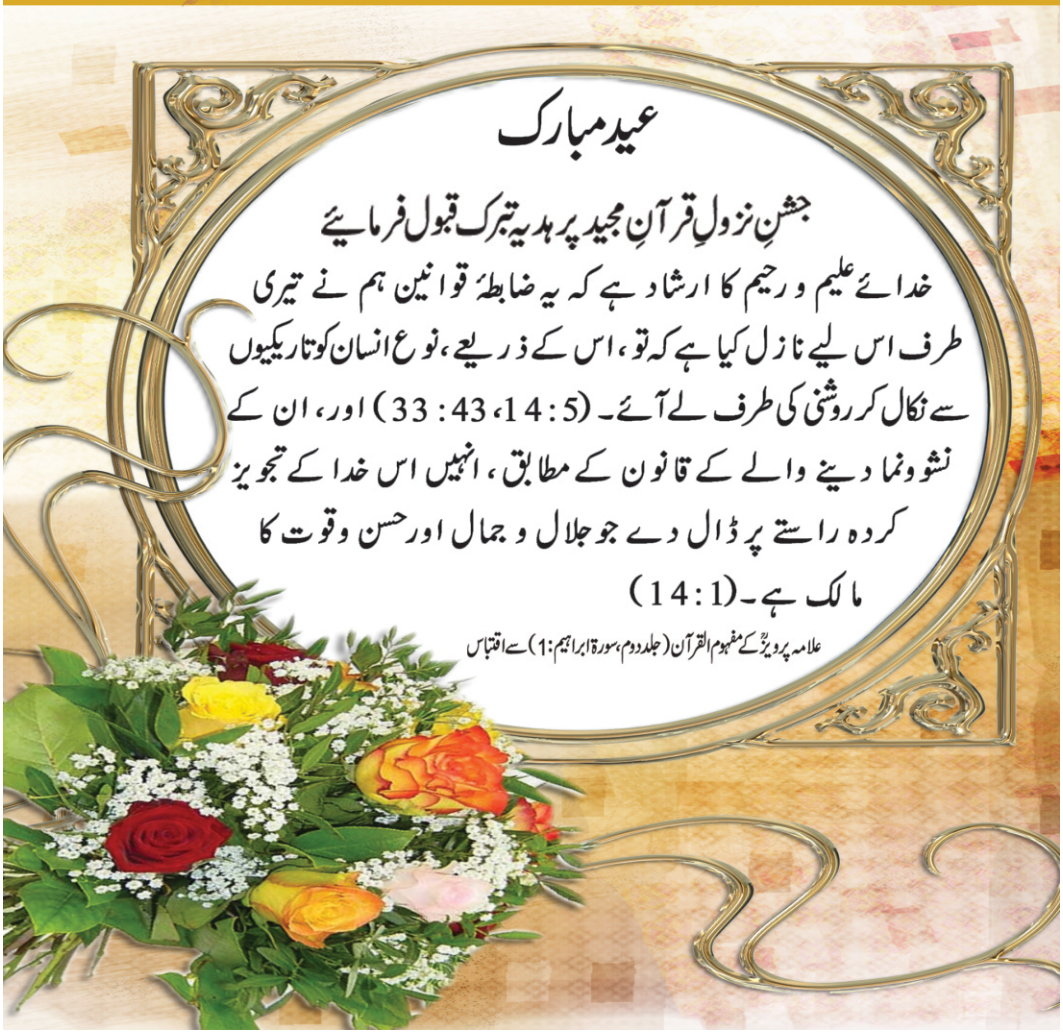

جلد 69 | شمارہ نمبر 07 | جولائی 2016ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط دہم)	منظور حسین لیل	10
اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی۔(20:8)	خواجہ ازہر عباس	20
میں نے قرآن کیسے سمجھا	ڈاکٹر سنبل	26
میری متاعِ حیات	غلام احمد پرویزؒ	30
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	37

ENGLISH SECTION
Surah Al-Mutaffifin (سورۃ المطففین) -*Durus-al-Qur'an* By G.A.Parwez
Parah 30, Chapter 20 Translated by: Dr. Mansoor Alam — 52

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/5000 روپے سالانہ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غلام احمد پرویز

(مختصر تعارف)

علامہ غلام احمد پرویز (رحمۃ اللہ علیہ) کی ولادت باسعادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا، مولوی، چوہدری، رحیم بخشؒ حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویز کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرنگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھی۔

بی، اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے، قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تاکہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لیے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرنو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

علامہ پرویزؒ کی بصیرت قرآنی کے مطابق یہ نظریہ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہموسماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لیے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأت ایمانی تھی کہ

آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہوگیا ہے۔ لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں بالوضاحت کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ 1949ء میں آپ کی کتاب ''معراجِ انسانیت'' شائع ہوئی تو اس میں آخری باب ختم نبوت پر مشتمل تھا جو بعد میں ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' کے نام سے الگ کتابی صورت میں 1974ء میں شائع ہوا۔

علامہ اقبالؒ کے مجوزہ خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتداء 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم، ابلیس، ملائکہ، جن، شیطان، وحی، رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''، چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلہ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریمe کی سیرتِ طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ، ''انسان نے کیا سوچا'' کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عقلِ انسانی، انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لیے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لیے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظامِ ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آرہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہان فردا'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنت شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں

کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہب اسلام کہا جاتا ہے یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے۔ بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا، لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لیے استعمال کئے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ حکومت پاکستان کے رابطہ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآن مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا، یا ہو رہا ہو، ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی، جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی، نہ جماعت، نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندہ زیر لبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لیے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطہ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرراہ میری ملاقات ہوئی، تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے، سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گزری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی

ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔

(طلوع اسلام دسمبر 1978ء، صفحہ 49)

سلسلہ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہکارِ رسالت اور خصوصاً اس کا آخری باب ''شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد''، تصوّف کی حقیقت، مزاج شناسِ رسول، قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں، قرآنی فیصلے (5 جلد)، فردوسِ گم گشتہ، سلسبیل، منزل بمنزل، مقامِ حدیث، اسباب زوالِ امت، مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں، جہاد، جشن نامے، اقبال اور قرآن (2 جلد)، مثنوی اسرارِ خودی و رموز بے خودی (مجلسِ اقبال)، جاوید نامہ، مطالب القرآن فی دروسِ الفرقان (30 سے زائد جلدیں) ریڈیو اور ٹی وی کے لیے (تقریباً 18 گھنٹے کا ریکارڈڈ پروگرام)، کئی اہم موضوعات پر مضامین کے پمفلٹس مثلاً پاکستان اور اسلام کے خلاف گہری سازش، آئینِ پاکستان کے متعلق سوالنامے کا جواب، کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ ضبطِ ولادت، جہاں مارکس ناکام رہ گیا اور اس سے آگے، ماوزے تنگ اور قرآن، دین اور مذہب کا فرق وغیرہ وغیرہ۔

''سلیم کے نام'' (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ''اسلامی معاشرت'' اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین، بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔(Islam A Challenge To Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریک پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریکِ پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریکِ پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لیے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے

کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوعِ اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے، تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیاکریسی رائج کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء ''سنت'' کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لیے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پر زور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتوی کفر دے دیا۔ جس پر ایک ہزار علماء کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فرست، ماہنامہ طلوعِ اسلام کے ہزار ہا صفحات، ہفتہ وار درس اور تقاریر کے آڈیو/ ویڈیو ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر، تحریک پاکستان میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت، قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار۔ اپنے خلاف کفر کے فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تن تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

15 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (55:26-27)

اللہ تعالیٰ جناب علامہ پرویزؒ کو اپنے سحاب کرم سے نوازے (آمین) کون جانے اس پائے کی شخصیت پھر کب پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشقِ یک دانائے راز آید بروں

ہلالِ عید

غرّۂ شوّال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار! آ! کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے! اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو اور جو بے آبرو تھے، ان کی خود داری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اقبالؒ

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط دہم

پرویز صاحب کا نظریہ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

نظامِ سیاست

مشاورت:

اسلام میں نظامِ مشاورت کو ہر معاملے، خصوصاً قانون سازی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پرویز صاحب اپنی شہرہء آفاق کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ''سیاسی نظام'' پر لکھتے ہوئے ''نظامِ مشاورت'' کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔ ''کسی سابقہ حکم کا من وعن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا، پیشِ نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، بالخصوص جب ان احکام و جزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کرنی ہو۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر، قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو (3:159)، اور حضور ﷺ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے (42:38)، یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔''

اصولِ مشاورت:

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ:۔ ''اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت، شورائیت پر مبنی ہے۔ یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری اُمت پر، اور اس کا کاروبار، افرادِ اُمت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے۔۔۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ خود نبی اکرم ﷺ سے بھی کہا گیا تھا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159) امورِ مملکت میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن نے صرف یہ اصول دیا ہے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اس کا تعین خود نہیں کیا کیونکہ عملی شکل مختلف زمانوں میں مختلف ہوسکتی ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق، اس کا تعین ہمیں خود کرنا چاہیئے۔ اس اصول میں، قرآن کریم نے (بینھم) کی جو شرط عائد کی ہے (یعنی افرادِ اُمت آپس میں مشورہ کریں) وہ بڑی اہم ہے اور دین میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔'' (طلوعِ اسلام

ستمبر 1977ء صفحہ نمبر 12) پرویز صاحب ''شاہکارِ رسالت'' میں کہتے ہیں:۔ ''قرآن کریم نے، اُمت کے لئے مشاورت کو ضروری قرار دیا، لیکن اپنے مخصوص انداز کے مطابق، مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی، اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریق کار خود متعین کرے۔'' باب۔ سیاسی نظام)۔ ''یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا، وہ احکامِ خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہوسکتا۔ اول تو وہی مجلسِ مشاورت، جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور وفکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلسِ مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدود اللہ تو اپنے مقام پر محکم، اٹل، اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر وتبدل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے سچے جانشینوں ؓ کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشاء یہ تھا کہ اُمتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد پھر سے اُس نظامِ کہن کی طرف نہ پلٹ جانا جس میں خدا کی بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔'' (3:143)۔ طلوعِ اسلام اپریل 1979ء۔ صفحہ نمبر 48-47۔

طریقِ مشاورت:

طلوعِ اسلام اکتوبر 1983ء، صفحہ نمبر 53: ''(1)۔ مجلسِ مشاورت میں سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی دیگر ارکان جیسی ہوتی ہے۔ اور ہر رکن کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ (2)۔ مجلسِ مشاورت میں بحث اس نکتہ پر ہوتی ہے کہ خدا کی کتاب اس باب میں کیا راہنمائی دیتی ہے۔ (3)۔ اس راہنمائی کے سامنے آجانے کے بعد، سب اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ (4)۔ فیصلہ نہ صدر کا ہوتا ہے، نہ وزیرِ اعظم کا۔ فیصلہ کتاب اللہ کا ہوتا ہے جس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ (5)۔ اسلامی حکومت میں علماء کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا جن سے شرعی فتویٰ مانگا جائے۔۔۔ اس میں ارکانِ امت قرآن کریم کی روشنی میں خود فیصلے کرتے ہیں، جنہیں حکومت، اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیتی ہے۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی روشنی میں مشاورت کا طریق، نہج اور فیصلہ کا معیار کیا ہوتا ہے؟ قرآن سے اپنی تائید میں سند پیش کرنے کا حق اُسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو پہلے اس کا اعلان کرے، اور اس کا عمل بھی اس کے مطابق ہو کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔ ''جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔'' جس مملکت کی بنیاد خدا کے متعین فرمودہ اس غیر متبدل اصول پر نہ ہو، وہ حکومت اسلامی نہیں، سیکولر ہوتی ہے اور سیکولر حکومت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟۔۔۔ اگر روش یہ اختیار کر لی جائے کہ قرآن کا جو فیصلہ اپنے مفیدِ مطلب ہو اسے اختیار کر لیا جائے اور دیگر معاملات غیر قرآنی رہیں تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید آئی ہے بڑی لرزہ

انگیز ہے۔اُس نے کہا ہے :۔(مفہوم)۔''کیا(تمہاری یہ روش ہے کہ) تم کتاب اللہ کے کسی حصہ کو تسلیم کرتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو! جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی دنیاوی زندگی ذلت وخواری کی ہو گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔''

مشورہ کے بعد فیصلہ کون کرے گا؟:

طلوعِ اسلام اکتوبر 1984ء،ص:7:۔''اس کا جواب قرآن کریم نے بطریق احسن دیا ہے۔مشورہ کا حکم دو جگہ آیا ہے۔ایک جگہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ (3:159) ۔''معاملات میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔'' چونکہ حضور ﷺ صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے اس لئے (ظاہر ہے کہ) آخری فیصلہ بھی حضور ﷺ ہی کے لئے تھا۔خود آیت میں اس کے بعد ہے: فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔''پھر جب تو ارادہ (فیصلہ) کر لے تو قوانین خداوندی کی محکمیت پر بھروسہ کر کے،اس کے مطابق عمل پیرا ہو جا۔''۔''عزمت''،حضور ﷺ ہی کے لئے ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا انداز یہ بھی ہے کہ مخاطب رسول اللہ ﷺ ہوتے ہیں اور مراد جماعتِ مومنین ہوتی ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں فیصلہ آپ ﷺ ہی پر چھوڑا گیا ہے۔آپ ﷺ سربراہِ مملکت ہی نہیں تھے،رسول بھی تھے۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔''بات یہ تھی کہ حضور ﷺ کو جس انداز سے مشورہ کا حکم دیا گیا تھا نظر آتا ہے کہ اس میں فیصلہ حضور ﷺ ہی پر چھوڑا گیا تھا۔حضور ﷺ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38)۔''ان کے امورِ مملکت ان کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔'' یہاں (رسول اللہ ﷺ کی طرح) کسی کو باقیوں سے مشورہ کرنے کے لئے نہیں کہا گیا۔کہا یہ گیا ہے کہ''ان کے معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔''اس میں امیر یا سربراہ کی حیثیت دوسروں سے ممتاز نہیں۔مشاورت میں وہ بھی دوسروں کے ساتھ شامل ہوگا۔یوں کہئے کہ وہ بھی مجلسِ مشاورت کا ایک رکن ہوگا۔اور اسی حیثیت سے مشورہ دے گا۔یہ بات اس مجلس پر موقوف ہے کہ وہ طے کرے کہ فیصلہ کس طرح ہوگا؟۔اس فیصلہ کا نفاذ البتہ امیر (سربراہِ مملکت) کی طرف سے ہوگا۔(اسے طلوعِ اسلام میں مرکزِ ملت کہہ کر پکارا گیا ہے یعنی امت کی مرکزی اتھارٹی)۔اس قسم کی اتھارٹی کا وجود آئینی تقاضا ہوتا ہے۔اس نظام میں سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی بس اتنی ہوتی ہے۔منشائے خداوندی یہ تھا کہ اس نظام کو حضور ﷺ کے بعد بھی جاری رکھا جائے۔: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ۔

''محمد بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک پیغمبر ہے۔'':

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ۔''اس قسم کے رسول پہلے بھی آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے دنیا سے چلے گئے۔'':اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ۔''اگر کل کو یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم یہ کہہ کر کہ نظامِ خداوندی تو آپ ﷺ کی زندگی تک تھا۔آپ ﷺ کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو گیا،پھر اپنے نظامِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟۔'': وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ۔۔۔(3:144)۔''جو ایسا کرے گا وہ کچھ اپنا ہی بگاڑے

گا۔خدا کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا‘‘۔ یہ نظام اس طرح آگے چلنے کے قابل اسی لئے تھا کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر تھی۔ جو اپنی مکمل غیر متبدل شکل میں محفوظ تھا۔اس کے ساتھ ایک امت موجود تھی جس نے باہمی مشاورت سے اس نظام کو قائم رکھنا تھا۔حضور ﷺ کے کچھ عرصہ بعد تک یہ قائم رہا لیکن اس کے بعد (قرآن نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا) امت نے وہی کیا۔وہ قرآن کو چھوڑ کر ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی طرف پلٹ گئی۔اس کے بعد امت پر جس قدر تباہیاں اور بربادیاں آئیں اس کی یہی وجہ تھی (اور یہی وجہ ہے)۔اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے یہ سمجھنا کہ ہم اسلامی زندگی بسر کر سکتے ہیں، انتہائی خود فریبی ہے۔‘‘

اسلامی نظامِ مشاورت اور مغربی جمہوریت:

طلوعِ اسلام اپریل 1978ء، ص:47، پر مغربی جمہوریت کے مقابلے میں اسلامی نظامِ مشاورت پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ اسلامی مملکت میں جزئی قوانین، جو کہ ابدی اور غیر متغیر نہیں ہو سکتے بلکہ حالات کے مطابق تبدیل کئے جا سکتے ہیں، قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و اقدار کی حدود میں رہتے ہوئے وضع کئے جائیں گے۔’’یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرما دیا کہ یہ کچھ جماعتِ مومنین کے باہمی مشورے سے کیا جائے گا۔۔آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نظامِ مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمتِ بالغہ ہے۔(ضمناً) آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظامِ مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔۔انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظامِ مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔قرآن کے نظامِ معاشرت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔لیکن مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود و قیود عائد نہیں ہوتے۔اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پاتا ہے۔یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔سورہء انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں یعنی آیت (6:115) جس میں یہ کہا گیا ہے کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔اس کے ساتھ آیت (6:116) میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔

اتباعِ اکثریت کا امتناع:

ازاں بعد خدائے سمیع و علیم نے فرمایا: (مفہوم) ’’اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دے گی۔جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں‘‘ (6:117)۔آپ دیکھئے کہ خدائے سمیع و علیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظامِ جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

انسانوں کو اس قسم کے اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرکِ عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کی اجازت دیتا ہے۔''۔ (بات اکثریت یا اقلیت کی نہیں، بات قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے رائے دینے اور فیصلے کرنے کی ہے۔ یہ درست ہے کہ اکثریت کی رائے صحیح ہوسکتی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ (کم پڑھے لکھے افراد کی) اکثریت کے مقابلے میں کسی ایک (زیادہ عالم فاضل) شخص کی رائے صحیح ہو۔ مشاورت کے عمل میں، بحث ومباحثے کا بنیادی نکتہ اور آخری فیصلہ یہ ہوگا کہ کہیں یہ سب کچھ قرآن کریم سے متصادم تو نہیں ہے؟۔ مئولف)۔

حق، حق ہے:

طلوعِ اسلام ستمبر 1973ء، ص:13، ''قرآن کریم کی رو سے حق، حق ہوتا ہے، خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے۔ اور باطل، باطل، خواہ اس کے حق میں ساری دنیا ہو۔ جب نبی اکرم ﷺ نے پہلی مرتبہ حق کی آواز بلند کی کہ (انا) اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (39:12) تو یہ حق کی آواز تھی۔ حالانکہ اس وقت (دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق) اس آواز کا (Second) کرنے والا بھی ہنوز کوئی نہ تھا۔ اور اکثریت ہی نہیں بلکہ) ساری دنیا اس کے خلاف تھی۔ اکثریت، کو معیارِ حق و باطل قرار دینا، مغربی نظامِ جمہوریت کا وضع کردہ تصور ہے، جو یکسر باطل اور اسلام کی نقیض ہے۔ قرآن کریم کی رو سے معیارِ حق و باطل، خدا کی کتاب ہے اور کفر و ایمان میں خطِ امتیاز۔ ارشادِ خداوندی ہے: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44)۔ جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔''

کنٹرولڈ ڈیما کریسی:

یہاں پرویز صاحب ایک بار پھر مغربی جمہوریت، جسے آج دنیا کا بہترین نظامِ مشاورت سمجھا جاتا ہے، کو سامنے لاتے ہیں اور اسلام کے نظامِ مشاورت کے ساتھ اس کا موازنہ کرتے ہیں:۔ ''یورپ نے، ملوکیت اور تھیا کریسی سے تنگ آ کر، جمہوریت (ڈیما کریسی) کا نظام وضع کیا اور اس کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دنیا اسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی، مسلم اقوام نے بھی اسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابقِ اسلام قرار دے دیا۔ چنانچہ آج اس نظریہ کو مسلّمہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ''جمہوریت عین اسلام'' ہے۔ بلکہ یہ کہ جمہوریت کی طرح، ہی اسلام نے ڈالی تھی۔ یہ تصوّر غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدارِ مطلق (Sovereignty) عوام کو حاصل ہے۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون مرتب کر سکتے ہیں، انہی کا فیصلہ حرفِ آخر ہے۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف، پوری نوعِ انسان کو بھی حاصل نہیں۔ اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہے اور اسلامی نظام (یعنی اُمت کے نمائندگان) کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے

ہیں۔ مغربی اندازِ جمہوریت اور اسلام کے نظامِ مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلامی نظام کو آپ ''کنٹرولڈ ڈیما کریسی'' کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ جمہوریت جس پر قرآن کا کنٹرول ہو۔''

ضوابط کی پابندی:

(مغربی) جمہوریت پر کسی قسم کی قدغن کو غلط اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی اعمال کو Regulate کرنے کے لئے ان پر قدغن لگانا کوئی غیر مفید کام نہیں۔ انسان اپنے آغاز ہی سے اپنے اعمال ونظریات کو کنٹرول کرنے کے لئے (معاشرت، شادی، غمی، معاشیات، سیاسیات وغیرہ کے) اصول وقوانین (آئین) وضع کرتا، اُن میں تبدیلیاں کرتا اور اُن پر عمل کرتا چلا آرہا ہے۔ اُن اصول وقوانین کی خلاف ورزی کو غلط، ناجائز، باطل اور قابلِ سزا جبکہ اُن کی عدم خلاف ورزی کو صحیح، جائز، حق اور قابلِ جزا مانا جاتا رہا ہے۔ (اگرچہ عملاً انتخابات کے موقع پر بہت سے قواعد وضوابط نافذ کئے جاتے ہیں جن پر پورا نہ اُترنے والوں کو انتخابات میں حصہ لینے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے مثلاً آئینِ پاکستان کا آرٹیکل نمبر 62-63) لیکن نظری طور پر جمہوریت پر کسی قسم کی قدغن کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے! آخر جمہوریت پر کیوں نہ کسی ایسی اتھارٹی کا کنٹرول ہو جو سب سے اعلیٰ، خامیوں سے پاک ہو اور (Infallible) ہو۔

جمہوریہء شورائیہ:

اسی سلسلے میں پرویز صاحب نے ایک اصطلاح وضع کی ہے جسے وہ ''جمہوریہء شورائیہ'' کہتے ہیں۔ جون 1977ء کے طلوعِ اسلام کا صفحہ نمبر 25 ملاحظہ ہو، جہاں وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں: ''اُمت اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، خود تجویز کرے کہ اس مشاورت کے لئے عملی اسکیم کون سی اختیار کرنی چاہئے۔ اس اعتبار سے یہ نظام ''جمہوریہء شورائیہ'' کہلا سکے گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جمہور کو جملہ اختیارات، قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوں گے۔ وہ نہ تو ان حدود میں کمی بیشی کر سکیں گے اور نہ ہی ان سے تجاوز۔ اس میں ''تھیا کریسی'' کا شائبہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس مملکت میں کسی کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ یہ صرف احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔''

جمہوری نظام کے اساسی اصول:

طلوعِ اسلام ستمبر 1973ء، ص:29:۔ ''مغرب کے جمہوری نظام (ڈیما کریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

(1)۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدارِ مطلق حاصل ہے۔ (Demo-cracy) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

(2)۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں۔ اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

(3)۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

(4)۔ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حرفِ آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

(5)۔عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے، وہ سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے۔ جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آ جائے۔

(6)۔ برسر اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اُسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔ خود عوام بھی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے اربابِ فکر ونظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا، جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان اربابِ علم ودانش کے نتائجِ فکر کو سامنے لائیں، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

یورپ کا انقلاب:

اقوامِ یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بُری طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور اربابِ کلیسا کی تھیاکریسی۔ تھیاکریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے۔ جس نے کہا تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے۔ اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیاراتِ خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا، حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریہء حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حقِ اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے، نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یوں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرینِ یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش وخروش اور مسرت وانبساط سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اسے نوعِ انسان کے لئے آیہء رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریہء جمہوریت (ڈیماکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبدادِ ملوکیت اور قہرمانیء مذہبی پیشوائیت سے حصولِ نجات پر منفیانہ ردِعمل تھا، نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرینِ مغرب جس

نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں، میں اپنی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔'' اس کے بعد، پرویز صاحب نے مغرب کے مختلف مفکرین کے مزید حوالہ جات پیش کر کے مغربی جمہوریت کو ناکام اور قرآنی نظام کو کامیاب ثابت کیا ہے (مئولف)۔

اسلامی نظامِ مشاورت:

''معراجِ انسانیت''۔ باب ''نظامِ مملکت'':۔ یہاں پرویز صاحب مشاورت کے اسلامی اور مغربی اصولوں کا موازنہ بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قرآن کریم اور مغرب کے اصولِ مشاورت کو گڈ مڈ کرنے سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔۔۔ ''واضح رہے کہ اس مشاورت اور دورِ حاضرہ کے جمہوری آئین میں بنیادی فرق ہے۔ دورِ حاضر کی جمہوریت میں، قانون بنانے والی اتھارٹی (خواہ وہ نمائندگانِ قوم پر مشتمل پارلیمان ہو، یا اس پارلیمان کی مقرر کردہ کوئی اور جماعت) اس بات کا پورا پورا اختیار رکھتی ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے قوانین بنائے اور جن قوانین کو چاہے منسوخ کردے یا ان میں ردوبدل کردے۔۔ اس کے برعکس، اسلامی جمہوریت میں، قانون سازی کا اختیار، بلا حدود و قیود نہیں ہوتا۔۔ اس میں، مجلسِ قانون ساز، قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین بنا سکتی ہے۔ وہ نہ ان حدود سے تجاوز کر سکتی ہے نہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکتی ہے۔ اسلامی نظام میں اس ''مشاورت'' کا طریقِ کار کیا ہوگا، اسے ملتِ اسلامیہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود طے کر سکتی ہے۔''

اسلام کا مغربی جمہوریت سے تقابل:

طلوعِ اسلام ماہ اکتوبر، نومبر 1977ء کے لمعات (اداریہ) میں اختصار کے ساتھ اسلام کا تقابل مغربی جمہوریت سے کیا گیا ہے۔ جس سے اسلام کا دوسرے نظاموں کے مقابلے میں فرق سامنے آتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:۔ ''ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ ہم مغرب کے جمہوری نظام کے نہیں بلکہ اسلامی جمہوریت کے داعی ہیں۔ اس پیوند سازی میں ''اسلام'' سے مراد مروّجہ مذہب ہوتا ہے۔ اور جمہوریت سے مقصود بہر حال مغرب کا جمہوری نظام۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو ملغوبہ تیار ہوتا ہے وہ ہمارے امراض کا اصلی سبب ہے۔ خالص (سیکولر) جمہوری نظام کفر ہی سہی، پھر بھی اپنے کچھ نتائج تو مرتب کر دیتا ہے۔۔ لیکن جب اس کے ساتھ مذہب کا پیوند لگا دیا جائے تو صورت وہ پیدا ہو جاتی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ:۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ۔ ''کیا تم کتاب خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔'' فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85)۔ ''یاد رکھو! جو بھی کفر و ایمان میں اس قسم کی پیوند سازی کرے گا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا۔ ہم اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔۔۔ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت کے

عناصرِ ترکیبی حسب ذیل ہیں:

(1)۔ایک خطہءارض (یا مملکت) کے اندر بسنے والے تمام افراد، بلالحاظ عقیدہ و مذہب، ایک قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ (2)۔اس قوم میں سیاسی اختلافات کی بناء پر مختلف سیاسی پارٹیاں وجود میں آتی ہیں۔(3)۔یہ سیاسی پارٹیاں انتخاب لڑتی ہیں، اور اکثریت کی پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے۔یہ ظاہر ہے کہ چونکہ اس پارٹی کا سیاسی نصب العین متعین ہوتا ہے اس لئے اس کے ارکان میں وحدتِ فکر و عمل ہوتی ہے۔ہم آہنگ افراد کے بغیر نہ کوئی پارٹی وجود میں آسکتی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے۔(4)۔پارلیمان میں، برسر اقتدار پارٹی کے بالمقابل، اس کی حریف پارٹی موجود رہتی ہے۔بالفاظِ دیگر، ایوان میں حزبِ اقتدار کے ساتھ حزبِ اختلاف کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔(5)۔مجلسِ قانون ساز (پارلیمان) افرادِ مملکت کے مذہبی عقائد و مسالک و رسومات سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی۔اور مختلف فرقوں کو شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔۔۔یعنی اس میں مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جاتا ہے۔(6)۔امورِ مملکت کے فیصلے پارلیمان کی اکثریت، بلا حدود و قیود، کرسکتی ہے۔یہ فیصلے ملکی قوانین (پبلک لاز) کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوتے ہیں اور ان کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوتا ہے۔(7)۔برسرِ اقتدار پارلیمان، ان قوانین میں، جب چاہے، ردوبدل بھی کرسکتی ہے۔اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ اس نظام میں کوئی عنصر غیر متبدل نہیں ہوتا۔ہر معاملہ میں اکثریت کا فیصلہ قولِ فیصل ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، قرآنی نظام کے عناصرِ ترکیبی حسبِ ذیل ہوتے ہیں:

(1)۔قومیت کا معیار، وطن کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان (دین) کا اشتراک ہے۔۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خطہءارض (یا مملکت) کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پاسکتے۔مسلم قوم کے افراد صرف مسلم ہو سکتے ہیں۔اسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔۔۔(2)۔امتِ مسلمہ، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔یعنی نہ اس میں کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے، نہ سیاسی پارٹیاں۔(3)۔اس امت کی مملکت میں، قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔جملہ قوانین، اصول و اقدار و حدود کی شکل میں، خدا کے مقرر کردہ اور اس کی کتاب (قرآن مجید) کے اندر منضبط اور محفوظ ہیں۔ان میں نہ کوئی ردوبدل کرسکتا ہے، اور نہ ہی حک و اضافہ۔۔۔(4)۔مملکت کا فریضہ، قرآن مجید کے ان غیر متبدل اصول و اقدار کو ملک میں عملاً نافذ کرنے کی تدابیر اور طریقے وضع کرنا ہوتا ہے۔۔۔جب یہ اصول و اقدار، ان طریقوں کے مطابق نافذ ہوں تو انہیں اسلامی شریعت یا اسلامی قوانین کہا جاتا ہے۔ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے اور ان میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق نہیں ہوتی۔۔یہ اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کے نافذ کرنے کے طور طریقے عندالضرورت بدلے جاسکتے ہیں۔۔۔جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں ''دین اور سیاست'' میں کوئی فرق نہیں تو اس کا عملی مفہوم یہی ہوتا ہے۔''دین''، کتاب اللہ کے اصول و احکام اور ''سیاست'' انہیں نافذ کرنے کے طور

طریقے۔(5)۔یہ طور طریقے، امت (مسلم افرادِ مملکت) کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔اس ''مشورہ'' کے لئے، اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، کوئی سا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔۔۔جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، چونکہ امت میں نہ کوئی سیاسی پارٹی ہوتی ہے نہ مذہبی فرقہ، اس لئے مجلسِ مشاورت کے اراکین کے انتخاب کا معیار، قرآنی نقطہء نگاہ سے، اہلیت اور صلاحیت ہوتا ہے اور بس۔(6)۔اس مجلسِ مشاورت (یا پارلیمان) میں نہ حزبِ اقتدار نہ حزبِ اختلاف۔نہ ہی اس میں اقتدار کسی خاص طبقہ کو حاصل ہوتا ہے۔۔اقتدار (یعنی قوانینِ خداوندی کے نافذ کرنے کے اختیار) میں ساری امت برابر کی شریک ہوتی ہے۔اور برابر کی ذمہ دار۔۔اور ان قوانین کا اطلاق بھی تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوتا ہے۔۔۔تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔۔۔کا یہی عملی مفہوم ہے۔۔اس پورے کے پورے نظام کو ''الدین'' یا آج کل کی اصطلاح میں ''اسلامی نظامِ مملکت'' کہا جائے گا۔اگر اس کے، مذکورہ بالا، اجزائے ترکیبی میں سے کسی ایک جزو کی بھی کمی ہو جائے گی، یا اس میں ردوبدل کیا جائے گا تو وہ نظام ''الدین'' یا ''اسلامی'' نہیں رہے گا۔عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ میں یہی نظام رائج تھا۔آپ غور کیجئے! کہ اس نظام اور مغرب کے جمہوری نظام میں کوئی بھی قدرِ مشترک ہے؟۔قدرِ مشترک تو ایک طرف، یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔''

دونوں کا فرق:

طلوعِ اسلام اگست 1980ء، ص:12: ''اگر امت، باہمی مشاورت سے، قرآن مجید کے ابدی اور غیر متبدل اصول واقدار کے حدود کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت کے فیصلے کرے تو یہ اسلامی جمہوریت ہوگی۔(اگرچہ مناسب یہی ہے کہ اس کے لئے جمہوریت کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے)۔اور اگر ان حدود وقیود کے بغیر فیصلے کئے جائیں تو وہ مغربی جمہوریت ہوگی۔اسے سیکولر نظامِ حکومت کہتے ہیں جو قرآنی نظام کی ضد ہے۔دو باتیں یاد رکھئے!۔ایک تو یہ کہ اسلامی مملکت (استخلاف فی الارض) پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے۔کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کا اس پر اجارہ نہیں ہوتا۔اور مملکت پابند ہوتی ہے قرآنی حدود کی جو، ابدی اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔''

جمہوریت بطور دین:

اسے مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہئے کہ آج (مغربی) جمہوریت ایک ''دین'' کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس پر ہم (حتیٰ کہ ہمارے مذہبی راہنمایان تک) فریفتہ نظر آتے ہیں (موءلف)۔

(جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۔(20:8)

جہاں تک ذات باری تعالیٰ سبحانہٗ ،عزاسمہٗ کا تعلق ہے ذہنِ انسانی یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ وہ اس ذاتِ عالی کی کنہ وحقیقت کا ادراک کر سکے۔ ایک محدود ذہن لامحدود کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا تصور تو بہت بڑی بات ہے۔ ذہن انسانی تو مجرّد Time اور Space کا بھی تصور نہیں کرسکتا۔ اس لیے قرآنِ کریم نے ذاتِ باری تعالیٰ کی کنہ اور حقیقت کے متعلق کچھ بھی نہیں بیان فرمایا۔ قرآنِ کریم نے صرف صفاتِ خداوندی کو بیان کیا ہے۔ ان صفات جلیلہ کی رُو سے اللہ تعالیٰ کا جو تصوّر سامنے آتا ہے وہ بہت ہی منزہ، وبلند واعلیٰ تصور ہے۔ ایسا تصور نہ تو عقل انسانی پیدا کرسکتی ہے اور نہ ہی وہ تصور کسی اور جگہ مل سکتا ہے۔ صفاتِ خداوندی پر غور وتدبر کرکے ہم کائنات کے بے شمار اسرار وحقائق معلوم کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں جو کچھ ہے اُنہیں صفات کا ظہور اور ان کا جلوہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بے شمار ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام نے ان اسماء میں سے 99 الگ شمار کرلیے ہیں۔ قرآنِ کریم میں جس اسم کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوا ہے اس اسم کا اطلاق کرنا جائز ہے۔ اور جس اسم کا اطلاق، اس کی ذات عالیٰ پر نہیں ہوا۔ اس کا اطلاق کرنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں کمال کے کتنے ہی معانی پوشیدہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب نہیں ہے۔ یعنی یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں صفت پہلے اور فلاں صفت بعد میں ہے۔ اس کی تمام صفات قدیم اور ازلی ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کا علم اس کی قدرت سے پہلے ہے یا اس کی قدرت اس کے علم کے بعد ہے۔ یا اس کی حیات اس کے علم سے پہلے ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے حَیّ وعلیم وقدیر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہی ہونے کے باوجود سب کمال کے ساتھ متصف ہے۔ جیسے ایک شخص ڈپٹی کمشنر ڈپٹی کلکٹر، سٹی مجسٹریٹ ہوسکتا ہے۔ لیکن کام کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے مختلف نام ہوگئے۔ اسی طرح نبی اور رسول ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ اس جہت سے کہ وہ علمِ الٰہی حاصل کرتا تھا وہ نبی تھا اور اس جہت سے کہ وہ اس علمِ الٰہی کو انسانیت تک پہنچاتا تھا وہ رسول کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ ہوتا وہ ایک ہی شخص تھا۔ اسی طرح ذاتِ باری تعالیٰ بھی جدا جدا کاموں کی وجہ سے رب، علیم، حکیم، خبیر ہے۔ صفات کا متعدد ومتنوع ہونا، اس کی وحدانیت میں حارج نہیں ہوتا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات تمام موجودات کی اساس ہے۔ اسی طرح مخلوق کے کمالات کی اصل اللہ تعالیٰ کے کمالات

ہیں۔مخلوق کے اندر جو بھی کمال ہے وہ اللہ کے کمال کا ظل ہے اور مخلوقات کا وجود اس کے وجود پر منوط ہے۔اگر سورج کا وجود ہی نہ ہوتا تو زمین میں روشنی کس طرح ہوسکتی تھی۔آگ میں حرارت نہ ہوتی تو پانی کیسے گرم ہوتا۔اگر خالق میں کمال نہ ہوتا، تو وہ کمال مخلوق میں کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ جسم اور نفس کا مرکب ہوتا ہے زندگی جب حیوانیت کے درجہ پر پہنچ کر آگے بڑھی ہے اور انسانیت کے درجہ پر پہنچی ہے، تو اس کو نفخ روح کے ذریعہ ایک صلاحیت عطا ہوئی (32:9) جس کو جب ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو اس کو روح کہتے ہیں۔اور جب اس صلاحیت کو انسانیت کی طرف منسوب کرتے ہیں تو اس کو نفس کہتے ہیں۔یہ توانائی ایک ہی چیز ہے۔لیکن اس کے نام دو ہیں یعنی روح خداوندی اور نفس انسانی کہ بچہ جب تولید ہوتا ہے تو یہ جسم اور نفس کا مرکب ہوتا ہے۔چند انچ کا جسم اور بالکل Clean slate جیسا نفس۔ان دونوں چیزوں جسم اور نفس کی پرورش کرنا مقصدِ حیات ہے۔جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔جبکہ نفس انسانی کی پرورش مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی کے ذریعے ہوتی ہے۔اس بچے کی نفس میں جو پیدائش کے وقت بالکل Clean Slate کی طرح ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ساری صفات کی صلاحیت inborn، inbuilt، inmate، dormant، خوابیدہ، مضمر اور مخفی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان مضمر صلاحیتوں، صفاتِ خداوندی، کو اپنے میں پرورش کرتا جائے۔ان کو اپنے میں پیدا کرتا چلا جائے۔صفاتِ باری تعالیٰ علی حد بشریت انسان میں منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں۔ہر مسلمان کو رحیم، کریم، رازق، خبیر، علیم، رؤف، ستار، جبار ہونا چاہئے اسی طرح امت مسلمہ کو بھی بہ حیثیت مجموعی ان صفات کا حامل ہونا چاہئے۔اسی طرح اسلامی مملکت کی بنیاد بھی ان ہی صفات پر ہونی چاہئے۔اسلامی مملکت میں صفات خداوندی پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔اسلامی مملکت خود بھی ان صفاتِ خداوندی پر عمل کرتی ہے اور ان صفات کو سارے معاشرے میں پھیلائے چلی جاتی ہے۔سورۂ حشر کی آخری آیات کریمات تلاوت فرماویں۔اللہ تعالیٰ کا تصور ذہنِ انسانی اس سے بہتر یا اس طرح کا بنا ہی نہیں سکتا۔صرف تلاوت کرنے سے ہی اس کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ان صفات کو بیان کرنے کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (59:24) اسلامی معاشرہ جو خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے اس معاشرہ میں ان صفات کو عملاً جاری کیا جاتا ہے۔اس کے بعد ان صفات کی اہمیت کے لیے جو کچھ ارشاد ہوا، وہ بڑا ہی غور طلب نکتہ ہے فرمایا: یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (59:24) ان صفات خداوندی کو عملاً جاری کرنے کے لیے کائنات کی ہر چیز پوری پوری کوشش کر رہی ہے اس آیۂ کریمہ میں لہٗ کی جو ضمیر استعمال کی گئی ہے تو اس جگہ یہ لام، نافع ہے۔یعنی یہ کہ کائنات کی ہر چیز ان صفات کے فائدہ اور نفع کو انسانیت کے لیے مہیا کر رہی ہے۔ان صفات کو فائدہ مند بنانے کے لیے کائنات کی ہر چیز پوری پوری کوشش کر رہی ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق صحیح طور پر اسی وقت استوار ہوتا ہے جب ہم اس کی صفات کو اپنے میں پیدا کرتے

ہیں اور اپنے آپ کو اس کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات متنوع بھی ہیں اور بعض مقامات پر متضاد بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظہور اقوام کی اپنی حالت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس طرح کے حالات ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کی صفت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (3:86) ترجمہ: بھلا خدا ایسے لوگوں کی کیوں کر ہدایت کرے گا جو ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے۔ حالانکہ وہ اقرار کر چکے تھے کہ پیغمبر برحق ہیں اور ان کے پاس واضح دلائل بھی آ چکے تھے اور خدا ایسے ہٹ دھرمی کرنے والے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

ایسی قوم کے لیے فرمایا: اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (3:87-88) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا اور فرشتوں اور دنیا کے سب لوگوں کی پھٹکار ہے۔ وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے نہ تو ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

ایمان لانے اور رسول کی تصدیق کرنے کے بعد جو قوم کفر کرتی ہے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جو صفت ظہور پذیر ہوتی ہے وہ بیان کر دی گئی کہ ان پر اللہ اور ملائکہ کی لعنت ہے اور ان پر عذاب ہے جس میں کوئی تخفیف نہیں ہوگی۔ اس صفت کے ظہور کے بیان کے بعد ارشاد ہوا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (3:89) ہاں مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی تو البتہ خدا بڑا بخشنے والا ہے۔ ارشاد ہوا کہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی تو پھر اس قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت کا ظہور ہوگا جو مغفرۃ اور رحم کی صفات ہیں۔ ایک ہی قوم کی دونوں حالتوں کو بیان کر کے، دونوں مواقع پر جن صفات کا ظہور ہوتا ہے وہ بیان کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظہور حالات کے تقاضے کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی جب تم اپنی حالت تبدیل کر لو گے، تو صفات کے ظہور میں بھی تبدیلی ہو جائے گی۔

(2)۔ ارشاد عالی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (2:159) ترجمہ: بے شک جو لوگ ہماری ان روشن دلائل و ہدایات کو، جنہیں ہم نے نازل کیا ہے، اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (تورات) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ ان کی ایک حالت بیان فرمانے کے بعد ان کی دوسری حالت بیان کی جاتی ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰۗىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (2:160) ترجمہ مگر جن لوگوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی، اور بیان کر دیا حق بات کو تو میں ان کو معاف کرتا ہوں۔ اور میں بڑا معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ اس قوم کی دونوں حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ جب وہ لوگ دلائل اور ہدایات کو چھپا رہے تھے۔ تو اللہ کی صفت لعنت یعنی ان کو نظام خداوندی کی برکات و ثمرات سے محروم کرنا، ظہور پذیر ہوئی اور جب

انہوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی۔ تو اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت کا ظہور ہوا اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔

(3)۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ ج فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (5:33-34) ترجمہ: جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑتے بھڑتے، اور احکام کو نہیں مانتے اور فساد پھیلانے کی غرض سے ملکوں ملکوں دوڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی سزا بس یہی ہے کہ یا تو مار ڈالے جائیں یا انہیں سولی دیدی جائے۔ یا اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں وطن کی زمین سے شہر بدر کر دیا جائے۔ یہ رسوائی تو ان کی دنیا میں ہوئی۔ اور پھر آخرت میں تو ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ مگر ہاں جن لوگوں نے، اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ توبہ کر لیں، تو ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے، کیونکہ سمجھ لو کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں بھی دونوں حالتیں بیان ہوئی ہیں پہلی حالت میں صفتِ خداوندی کا یہ ظہور ہے کہ ان کے محاربہ اور فساد کی وجہ سے ان کو سولی دیدی جائے۔ لیکن دوسری صورت جبکہ وہ توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت اور رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔

(4)۔ ارشاد فرمایا: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (5:38-39) ترجمہ: اور چور خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم ان کے کرتوت کی سزا میں ان کا ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ ان کی سزا خدا کی طرف سے ہے اور خدا بڑا زبردست اور حکمت والا ہے۔ ہاں جو اپنے گناہ کے بعد توبہ کر لے اور اپنے چال چلن درست کرے، تو خدا بھی اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظہور انسان یا کائنات کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (55:29) ترجمہ: جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، اس سے مانگتے ہیں، ہر آن اُن کا تقاضہ بدل جاتا ہے۔ انسان اور کائنات کی ہر چیز اپنی نشوونما کے لیے خدا کی محتاج ہے۔ اور ہر شے کی نشوونما کا تقاضہ بدلتا رہتا ہے۔ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کے معنی یہ ہیں کہ تم ہی نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ سب اپنی پرورش کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔ کائنات میں یہ کیفیت ہے کہ ہر آن اس کا تقاضہ بدل جاتا ہے۔ وہ پروردگار، وہ رب السمٰوٰت والارض اس کے تقاضوں کے مطابق نشوونما دیئے چلا جا رہا ہے۔ اور مختلف صفاتِ خداوندی، اور مختلف شئون الٰہی کا ظہور ہوتا چلا جاتا ہے۔

خدا کے ہر حکم کے اندر خدا کی ایک صفت کا عکس ہوتا ہے اگر اس حکم پر عمل کرتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو

اس حکم کی تعمیل میں انسان لذت محسوس کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کریں اور دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی ذات کی پرورش ہوتی ہے تو اس حکم کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر اسلامی مملکت کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایک ایک شہری کو رزق فراہم کرے، تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت کارفرما ہوتی ہے (11:6) قرآنِ کریم کے تمام احکام خدا کی صفات کے مظاہر ہیں اور اس کی صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

صفاتِ خداوندی پر عمل کرنا اور ان کو معاشرہ میں عملاً جاری ورائج کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو اس دنیا میں انسانوں کی معرفت ہی روبعمل لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ربوبیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تا کہ انسان اس کی صفت ربوبیت کو اس دنیا میں رائج کرے۔ ہر انسان پر اسلامی مملکت کا قائم کرنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے ذریعے صفات خداوندی کو اس دنیا میں عام کیا جائے اور ساری دنیا میں ان صفات کا ظہور ہو۔ اسلامی مملکت اپنی اساس ان صفات پر اس لئے رکھتی ہے کہ وہ اپنی حدود میں ان صفات کو عملا جاری کرے۔ اس وقت ہم صفاتِ خداوندی پر نظری وفکری طور پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلامی مملکت میں صفات خداوندی ٹھوس صورت میں سامنے آجاتی ہیں۔ مملکت خداوندی میں چاروں طرف صفاتِ خداوندی کا نور چمکتا نظر آتا ہے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں وہ نظام دے کر جارہا ہوں جس کی راتیں دن کی طرح روشن اور چمکدار ہوتی ہیں۔ یہ چمک صفات خداوندی کی ہی ہوتی ہے۔ اس مملکت میں زندگی بسر کرنے سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور مرنے کے بعد اگلی منازل طے کرتی ہے اس مملکت میں اس کے باشندے خود کو صفاتِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق بناتے ہیں۔ خدا کی ہر صفت، اس مملکت کے ہر شہری کو متنوع ذمہ داریوں اور بے شمار حقوق وفرائض کے سلسلوں کا پابند کر دیتی ہے۔ اس راہ پر جس قدر یہ شہری آگے بڑھتا ہے، اسی قدر اس کو قُربِ خداوندی حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اس مملکت کے رہنے والوں نے جس طرح صفاتِ خداوندی کو اپنے میں اجاگر کیا ہوتا ہے۔ اس کی حالت وکیفیت خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ایک ہی سینہ میں دو دل نہیں بلکہ ایک ہی سینہ میں بیک وقت دو متضاد صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں کفار کے مقابلہ میں متشدد ہوتے ہیں اور آپس میں تمام مومنین ایک دوسرے پر رحیم ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت کو ایک دوسرے مقام پر اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (5:54) ترجمہ: مسلمانوں پر نرم دل ہیں، اور کافروں پر زبردست ہیں۔ قرآن کریم نے خود ایسے مقامات کی کئی جگہ نشاندہی کی ہے۔

قرآن کریم میں صفاتِ خداوندی متنوع طور پر بیان ہوئی ہیں۔ لیکن جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر مقامات پر متضاد صفات بھی بیان ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ رحیم وکریم بھی ہے اور جبار وقہار بھی۔ یہ صفات حالات کے تقاضوں کے مطابق استعمال ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں اکثر مقامات پر کسی نہ کسی صفت کا بیان ہوا ہے۔ صفاتِ خداوندی کا بیان بلا

وجہ نہیں ہوا کرتا بلکہ جس قسم کے حالات کا ذکر سابقہ آیات میں آیا ہے ان حالات کے تقاضوں کے مطابق اس صفتِ خداوندی کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اگر ایک آیت میں کسی قوم پر عفو کا ذکر آیا ہے تو یہاں عفو کی صفت آتی ہے اور اگر کہیں عذاب کا ذکر ہوا ہے۔ تو یہاں عزیز و مقتدر کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ عفو کے مقام پر عفو، اور عدل کے عفام پر عدل۔

یہ صفاتِ خداوندی جو اکثر آیات کے بعد استعمال ہوتی ہیں اور جن کا ایک گہرا ربط ان آیات سے ہوتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے ان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہے۔ ان کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان صفات کا ان آیات سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ صورت ہوتی ہے کہ اگر کسی آیت کا مفہوم واضح نہیں ہو رہا ہے تو آپ اس کے ساتھ کی صفت ملاحظہ فرمائیں۔ اس صفت کے مفہوم سے یہ متعین ہو جائے گا کہ اس آیت کا مرکزی نکتہ کیا ہے۔ اس صفت کے مفہوم کو سامنے رکھ کر آیت پر مزید غور فرمائیں گے تو آیت رفتہ رفتہ واضح ہو جائے گی۔

صفاتِ خداوندی کو آیات سے ربط دینا ایک مشکل کام ہے۔ اور کسی مفسر نے یہ کام کیا بھی نہیں۔ اس لئے اس کو سرانجام دینا اور بھی مشکل ہے لیکن اس سے ایک طرف تو قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف قرآنِ کریم کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آیات کے ساتھ اس طرح صفاتِ کا ربط ذہن انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ صرف وحی الٰہی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس مضمون میں صفاتِ الٰہی کو آیات سے ربط دیں۔ پورے قرآن میں ایسے مقامات تقریباً 160 مرتبہ آئے ہیں۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے۔ اس کے لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کی تکمیل کے لیے دعا فرمائیں۔ یہ مضمون رسالہ طلوع اسلام میں بالاقساط طبع ہوتا رہے گا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (11:88)

سانحہ ارتحال

نہایت دُکھ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوعِ اسلام ملیرسٹی، کراچی کے بانی رُکن صوبیدار میجر محمود الحسن صاحب 24 مئی 2016ء کو اسلام آباد میں وفات پا گئے۔ مرحوم فکرِ قرآنی کی توسیع کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ بزمِ طلوع اسلام ملیرسٹی کراچی کے زیر انتظام بہت فعال کردار ادا کرتے رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خاندان، اور بزمِ ملیرسٹی کراچی کے اراکین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے قرآن کیسے سمجھا

میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا مگر پریشان میں اب بھی ہوتا ہوں۔ جب بھی ایسی کوئی بات جو میرے رونگٹے کھڑے کر دیتی یا جس سے میرے بدن میں کپکپی دوڑ جاتی ہے میں کسی دوست/عزیز سے شیئر (Share) کرتا ہوں تو اس کا ریکشن (Reaction) ایسے ہوتا ہے جیسے میں نے اسے بازار کے بھاؤ بتائے ہوں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس سوال نے مجھے ایک مدت پریشان رکھا۔ پھر قرآنِ پاک کے مطالعہ سے باقی تمام سوالات کی طرح اس کا جواب ملا۔

سچ فرماتے ہیں اللہ کریم کہ:

''پکارو، میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں گا۔''

آپ شاید پریشان ہو رہے ہوں کہ ایسی کیا بات ہے جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے یا کپکپی طاری کر دیتی ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلے میں، میں نے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کیا جن میں معارف القرآن (مولانا شفیع صاحب) تفہیم القرآن (مولانا مودودی صاحب) انوار القرآن (جناب مرتضیٰ ملک صاحب) اور بیان القرآن (مولانا تھانوی صاحب) شامل ہیں۔ ان تفاسیر سے رونگٹے کھڑے کرنے والی چند مثالیں حاضر ہیں۔

1۔ آیت (4:93) ترجمہ: جو کسی مسلمان کو قصداً ناحق قتل کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جائے گا۔

یہ ترجمہ لکھنے کے بعد مولانا تھانوی سائیڈ حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ مومن اپنے ایمان کی وجہ سے نجات پالے گا۔ علماء حق اس پر متفق ہیں کہ خلود فی النار، بجز کفر و شرک نہیں ہے''۔

2۔ آیت (4:101) تفہیم القرآن میں مولانا نے اس آیت کے ترجمے کے درمیان (خصوصاً) کا اضافہ کر کے ترجمے کے دو حصے کر دیئے۔ پہلا حصہ ''کسر نماز'' اور دوسرا ''صلاۃ خوف'' قرار پایا۔

3۔ معارف القرآن میں ''جنود لم تروھا'' کے بیان میں مولانا لکھتے ہیں کہ فرشتے نظر نہیں آتے۔ اس کے بعد ''عموماً'' کا اضافہ کر کے سائیڈ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ خصوصاً نظر آتے تھے۔

4۔ آیت (2:183) رہن (گروی) رکھنے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دوران سفر دی اور وہ بھی مشروط۔ لیکن

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ رہن رکھنا نہ صرف سفر میں جائز ہے بلکہ حضر میں بھی جائز ہے۔

5۔ آیت (2:180) میں اللہ تعالیٰ نے ''کتب علیکم'' لکھ کر وصیت مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی۔ لیکن ہمارے علماء کرام نے رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک حدیث (لا وصیت للوارث) کو وجہ جواز بنا کر اس حکم کو منسوخ کر رکھا ہے۔ اس طرح یہ وصیت فرض تو کیا نفل بھی نہ رہی۔

6۔ (2:184) مخصوص حالات میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اللہ نے روزہ نہ رکھنے کی چھوٹ دی مگر ہمارے مفسر لکھتے ہیں کہ یہ اجازت اللہ نے بعد میں منسوخ کر دی۔ کہاں لکھا ہے یہ نہیں بتاتے۔

ایسی بے شمار مثالیں ان تفاسیر میں موجود ہیں۔

مجھے ان علماء کی جرأت پر حیرانی ہوتی ہے کہ کس دیدہ دلیری سے قرآن میں اللہ کو جھٹلاتے ہیں۔ اُس کے احکامات میں ترامیم کرتے ہیں اور اپنے احکامات کو اُس کی آیات پر ترجیح دیتے ہیں۔

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ ۔۔۔(9:34)

والد مرحوم کی کوشش کے باوجود بچپن میں قرآن نہ پڑھ سکا۔ وہ مذہبی آدمی نہ تھے لیکن پڑھے لکھے باپ دادا کی اولاد ہونے کی نسبت سے کشادہ دل و دماغ کے مالک تھے انہوں نے ہم پر کسی مسلک یا مکتبِ فکر کی چھاپ نہ لگائی۔ اس پر میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔ (یہ احساس بھی قرآن فہمی سے پیدا ہوا)۔

قرآن نہ پڑھ سکنے کی پھانس میرے دل میں شروع سے تھی۔ بچپن سے پڑھنے کا شوق تھا اور سائنس کے طالبِ علم ہونے کی وجہ سے جو کچھ منبر و محراب سے سنتے اس پر بہت سے سوالات کھڑے ہوتے لیکن ان کا جواب نہ ملتا۔

ابتدائی طبّی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قرآن فہمی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ دوست احباب کے مشورے سے تفہیم القرآن پڑھنی شروع کی۔ لیکن پہلے سوالات کا کیا جواب ملتا۔ یہاں تو نئے سوالات کھڑے ہو گئے۔

اسی دوران ایک دوست کی شادی کے موقع پر اس کے بھائی کے کمرے میں آرام کی غرض سے گیا تو وہاں ایک مرصع جلد والی کتاب پر نظر پڑی۔ اندازہ ہوا کہ قرآنی سلسلہ کی کتاب ہے عادتاً اٹھا کر پڑھنی شروع کی۔ پھر وقت گزرنے کا احساس نہ رہا۔ سوالات کے جوابات ملتے گئے اور میں پڑھتا گیا۔ لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کتاب بند کی۔ الٹا کر سرورق دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی صاحب ہیں غلام احمد پرویز جنہوں نے تفسیر لکھی تھی۔

علامہ صاحب سے میرا یہ پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد سال ہا سال سے انہیں پڑھ رہا ہوں۔ اسی دوران عربی میں قرآن پڑھا۔ سات سال لگے۔

مجھ پر علامہ صاحب کا احسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں شاید آج بھی بھٹک رہا ہوتا۔ یا ہو سکتا

ہے گمراہ ہو چکا ہوتا۔ اللہ رحیم انہیں غریق رحمت کرتے اور ان کے درجات بلند کرے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے انہوں نے راہ پر لگائے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ مجھ میں تلاش حق کی جستجو کیوں تھی تو احساس ہوتا ہے کہ میں ایک شفاف اور سادہ ذہن کا مالک تھا۔ مجھ پر کسی فرقہ کی چھاپ نہ تھی۔ لہٰذا میں نے حق و سچ کو آسانی سے قبول کیا جبکہ میرے دوست/ رشتہ دار (جن میں سے زیادہ تر مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں) اسی چھاپ کی وجہ سے بے نیاز تھے۔

(2:256) اللہ فرماتے ہیں کہ کفر بالطاغوت کے بعد اگلا مرحلہ ایمان باللہ ہے۔

مفکرِ کہتے ہیں ؎

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

تاریخ انسانی اور قرآن اس کے شاہد ہیں کہ مذہب گزیدہ قوموں نے انہی پیغمبروں کی مخالفت کی جن کے وہ انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے۔ نہ صرف انہوں نے ان پیغمبروں کے پیغام کو رد کیا۔ بلکہ ان میں سے کئی ایک کو ناحق قتل بھی کیا۔ اس کے مقابلے میں وہ قومیں جو اہلِ کتاب نہ تھیں۔ انہوں نے وحی خداوندی کو آسانی سے قبول کیا اور دنیا و آخرت میں فلاح پائی۔

فرقہ پرستی کو اللہ نے شاید اسی لیے شرک قرار دیا ہے۔ فرقہ پرستی سے دل و دماغ بند ہو جاتے ہیں۔ انسان اس میدان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ کسی دلیل اور شہادت کا اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ اس کا دماغ ایک چھوٹے دائرے میں کام کرتا ہے لہٰذا وہ قرآن سمجھنے سے عاری ہوتا ہے۔

لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79)

جب فرقہ پرست اپنے مسلک کے مطابق لکھا گیا قرآنی ترجمہ و تفسیر پڑھے تو اس تحریر میں اُسے بے ربطی نظر نہیں آتی وہاں موجود اختلاف/ تضاد نظر نہیں آتا۔ اور جو روانی تحریر میں ہونی چاہیے اس کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہوتا مثلاً:

۞ اگر آپ ''اسرا'' کی مشہور زمانہ آیت پڑھیں کہ۔

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ۔''

روایات اگر ہمارے دماغ میں پیوست نہ ہوں تو یہ آیت کسی طرح بھی مروجہ معراج کا ثبوت نہیں بنتی۔ پڑھے لکھے حضرات واقف ہیں کہ اُس وقت مسجد اقصیٰ کا وجود نہ تھا یہ مسجد آنحضرت ﷺ کے انتقال کے 60 سال بعد عبدالملک بن مروان نے بنوائی۔ اسی جگہ پر موجود ہیکل سلیمانی بھی آپ ﷺ کی پیدائش سے 500 سال قبل تباہ

ہو چکا تھا۔

کھلے دماغ سے پڑھیں تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ آیت واقعہ ہجرت کا بیان ہے۔

اسی طرح مشہور آیت (2:142) سے قبلہ کی تبدیلی کی شہادت لی جاتی ہے۔ روایات کو ایک طرف رکھ کر پڑھیں تو سمجھ آتا ہے کہ یہ یہودیوں کی ناراضی کا جواب ہے جو کہتے تھے۔

''کہ اگر یہ دین ابراہیمی ہے تو قبلہ کیوں تبدیل کر دیا گیا۔''

قرآن میں اللہ نے مکہ کو ''ام القریٰ'' اور کعبہ کو ''اوّل بیت' کہا ہے۔ یروشلم کو قبلہ بنانے کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ لہٰذا قبلہ جب کعبہ ہی تھا تو اس کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عرب کا قبلہ تو روزِ ازل سے ہی کعبہ تھا جس کی تعمیر نو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی جبکہ ہیکل سلیمانی سینکڑوں سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کروایا۔

۞ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی۔۔۔ قرآن نے آپ ﷺ کو ''خلق عظیم'' کا لقب دیا جبکہ ہمارے مفسر لکھتے ہیں کہ ایک نابینا غریب صحابیؓ کا دخل دینا آپ ﷺ کو ناگوار گزرا اور آپ نے تیوری چڑھائی۔ حالانکہ یہ کچھ ایک سردارِ قریش نے کیا جیسا کہ قرآن نے ایک دوسری آیت سے واضح کیا۔ لیکن روایات کے زیر اثر ہم لکھتے ہوئے سوچتے بھی نہیں کہ کس کے بارے لکھ رہے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں۔ شرح صدر کی آیات (6:126)، (94:1)، (20:25) سے مفہوم صاف ظاہر ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے سلسلے میں شرح صدر کا مطلب شق صدر لینا صرف روایات کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ سینہ مبارک کو چاک کر کے صاف کرنا اور اس میں یقین، ایمان اور پاکیزگی بھرنا اور وہ بھی نبوّت کے بارہویں سال۔۔۔

الامان، استغفار، صد بار استغفار

خدارا۔ اپنی اولاد کو پڑھائیں لکھائیں اور ان کی مناسب تربیت کریں لیکن ان پر اپنی سوچ اور اپنی فکر مسلط نہ کریں۔ آپ کے بچے آپ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت کی بدولت حق اور سچ کو پہچانیں گے اور ساری زندگی آپ کو دعائیں دیں گے۔ ہوسکتا ہے آپ کی نجات کا ذریعہ بھی بن جائیں۔

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری متاعِ حیات

(پرویز صاحبؒ کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ من! انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے۔ درس کا وقت تو ایک گھنٹہ ہی ہوتا ہے مگر آج میں آپ سے کچھ زیادہ وقت مانگنا چاہتا ہوں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے' اس کا تعلق کچھ میرے جذبات سے ہے۔ دنیا کی ہر چیز' جو مرغوبِ خاطر ہو' پسندیدہ ہو' اس کا ختم ہونا' اس میں کمی آ جانا' انسان کے دل پہ گراں گزرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بھی انسانوں میں سے ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے زیادہ کچھ تو عرض نہیں کرنا لیکن یہ ضرور کہنا ہے کہ یہ متاعِ حیات' یہ سرمایہ زندگی' جو مجھے حاصل ہے' اللہ کا احسان ہے۔ گو کہ مجھے یہ کبھی اتنا میسر نہیں آیا' یا میں نے کبھی اتنا کچھ حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اتنا فراواں ہو اور جب اس میں کمی ہو تو مجھے اس کمی کا شدت سے احساس ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ میرے گزارے کے مطابق دیتا ہے۔ جو مجھے مرغوبِ خاطر چیزیں ہیں' جو میرے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لیے فنونِ لطیفہ کی چیزیں ہیں' ان میں کسی قسم کی کمی کا اور ان کے ختم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اپنے اندرونی جذبات کی نسبت سے ان چیزوں کے اندر کشش ہوتی ہے لیکن میری متاعِ حیات میرے لیے اس کائنات میں مرغوب ترین متاعِ حیات خدا کی کتاب ہے اور محبوب ترین ہستی اس کتاب کا لانے والا نبی اکرم ﷺ ہے۔

عزیزانِ من! اب اس وقت میں قرآن کی بات کرتا ہوں' دو منٹ کے بعد حضور ﷺ کی بھی بات کرونگا۔ قرآنِ کریم کی صورت یہ ہے کہ یہ ایک بحرِ بے کراں ہے' ایک ایسی ندی ہے کہ

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اس کے ختم ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جب اسے کاغذوں کے فانوس کے اندر ہم نے محفوظ کر دیا تو یہ مادی پیکروں کے اندر آ گیا۔ اب اس کا شمار بھی ہم اپنے حساب و شمار سے کرتے ہیں: پہلا پارہ، دوسرا پارہ، پھر تیسرا پارہ، اب میں اپنی اس کیفیت کو آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ بچپن سے پانچ چھ سال کا ہونگا کہ قرآن کا پارہ میرے ہاتھ میں آیا ہوگا۔ ٹھیک ہے وہ ہر بچے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ قریب پچاس سال سے' عزیزانِ من! میری کیفیت یہ ہے کہ اس دن کے سوا کہ

جب میں طبعًا معذور نہ ہوگیا ہوں' قرآنِ کریم کی پاکباز روشنی سے میری آنکھیں ہر روز منور ہوتی رہیں۔ یہ کیفیت پچاس سال سے ہے۔ پچاس سال سے! لیکن ایک ہی احساس میرے اوپر ہے' اسے آپ میری جذباتی کیفیت کہیے کہ جب بھی میں انتیسویں پارے کے آخر میں پہنچتا ہوں تو مجھے کچھ دھکا سا لگتا ہے کہ یہ ختم ہونے لگا ہے۔ ٹھیک ہے میں بھی منطق کی رو سے اس کی دلیل نہیں دے سکتا کہ جسے میں لامنتہی مانتا ہوں وہ ہے کیا؟ لیکن وہ جو محسوس قاعدوں سے' محسوس طریقوں سے' ہمارا شمار ہو رہا ہے پھر وہ کیا ہے؟ یہ جو میں نے اب آپ سے کہا ہے کہ یہ انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے' یونہی نہیں کہا۔ میرے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہی جو میں نے عرض کیا ہے' جو ساری عمر میرے ساتھ ہوتا رہا ہے' یہاں میں پہنچتا ہوں تو یوں احساس ہوتا ہے کہ اب یہ ختم ہو جائے گا اور میں پھر اس ختم نہ ہونے کے یا اس ختم ہو جانے کے احساس کو اس طرح سے بہلاتا ہوں کہ جب آخری سورۃ ''اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ'' تک آتا ہوں تو میں یہ کرتا ہوں: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ'' عزیزانِ من! میں اس کو یوں کر لیتا ہوں کہ وہاں کا وہ جوتا گاہے' میں اسے وہاں توڑتا نہیں' یہاں آ کے اس کی گرہ دے لیتا ہوں اور پھر شروع ہو جاتا ہوں۔

میرا عشقِ دروں:

انسان اپنے آپ کو بھی کس قسم کے حسین فریب دے لیتا ہے۔ یہ ہے میری قرآنِ کریم کے متعلق کیفیت۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا بحرِ ذخار ہے۔ میری یہ کیفیت ایک اور مقام پر اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھری۔ میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے اس کا نام معارف القرآن تھا' بعد میں الگ الگ جلدوں کے الگ الگ نام آئے اور اس میں حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی داستانِ جلیلہ مسلسل چلی آ رہی تھی۔ پہلے ''جوئے نور'' [1] آئی۔ وہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرتِ شعیب علیہ السلام تک ہے' پھر ''برقِ طور'' [2] آئی۔ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے آگے کا سلسلہ ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت انگیز داستان اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل انبیائے بنی اسرائیل کا بصیرت افروز تذکرہ ہے۔ پھر ''شعلہ مستور'' [3] آئی۔ یہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے متعلق ہے۔ اب وہاں یہ جو پیچھے سے سلسلہ چلا آ رہا تھا' جب میں نے ان کی داستان کے' آخری واقعے کو ختم کیا ہے تو ایسا محسوس ہوا جیسے انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے۔ وہ سلسلہ جو ختم ہوا اور آگے جو شروع ہونا تھا' اس کی جلالت و مرتبت کا تو پوچھو نہیں لیکن یہ چیز ہے کہ یہ جو اتنا سلسلہ دراز ہے وہ اب ختم ہو رہا ہے تو ایک

---

[1] اس کا پہلا ایڈیشن 1945ء میں زیورطباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔

[2] یہ معارف القرآن کی تیسری کڑی تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ تھے۔ یہ کڑی بھی سب سے پہلے 1945ء میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا وقت آیا تو مناسب سمجھا گیا کہ ہر جلد کو اس کے موضوع کی نسبت سے الگ نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے ''برقِ طور'' کے نام سے شائع کیا گیا۔

[3] اس کا پہلا ایڈیشن 1958ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ حضرت زکریا' حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ' سلسلۂ انبیائے کرام پر نگہۂ بازگشت اور اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے ابدی اصولوں پر مشتمل ہے۔

احساس تھا۔ میں نے اس مقام پہ پہنچ کر ''شعلہ مستور'' میں اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ الفاظ میں آپ کو سنا دوں۔ آپ اسے سن لیجیے۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے جو لکھا وہ میرے سامنے ہے اور آپ دیکھ لیجیے گا کہ جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا۔ پتہ نہیں بعض اوقات خود لکھنے والا بھی محسوس نہیں کرتا کہ کس عالم کے اندر یہ چیز لکھی جاتی ہے اور لکھی گئی ہے۔ میں نے لکھا تھا:

''طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق، جو صبح ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا [1] شبنمی چھاؤں میں، جانب منزل روانہ ہوا تھا، قندیل آسمانی کی بصیرت افروز وجہاں تاب روشنی میں، زمزمہ سنج ونغمہ بار، جذب وکیف کی نورانی وادیاں طے کرتا، اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دُور سے مسکراتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس منزل کی تکمیل ہوگی جس کے لیے خاک کے ذرے، مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکر آدم میں متشکل ہوئے۔ اور یہ پیکرِ آب وگل، مقامِ شرف ومجد انسانی کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا..... یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھیے ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے، آیئے ہم ان قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ وشاداب پھولوں کو دامن نگاہ میں لیے، ان کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچ کر، جہاں کا ہر سنگ ریزہ جلوہ فروش صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقف سجود ہوگی۔''

عزیزانِ من! چراغِ منزل آپ نے سمجھ لیا کہ میں نے کس کو کہا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس مقصد عظیم کی تکمیل ہوگی جس کے لیے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکر آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکر آب وگل مقام شرف ومجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔ نفوس قدسیہ کا یہ قافلہ رشد وہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کہکشاں سے فرازِ کوہ پر جلوہ بار وگوہر ریز ہوئی اور سینۂ کوہ کو چیرتی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سرودِ زندگی کو اپنی لہروں کے آغوش میں پرورش دیتی، داخلِ دشت وصحرا ہوئی۔ ''محمد ﷺ'' گوئٹے [2] کی ایک نظم ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے ہاں فارسی زبان میں اس نعت کا ترجمہ کیا ہے۔ دنیا میں میرے نزدیک اس سے بلند مقام شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ اقبال نے اپنے ہاں بھی لکھا ہے مگر گوئٹے جو کہہ گیا ہے وہ عجیب حقائق کی دنیا ہے۔ میں اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ اُس نے لکھا ہے کہ

در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب

محمد ﷺ! یہ ہیں وہ لوگ جن کی آنکھیں پالیتی ہیں کہ یہ کیا مقام تھا اور یہ کیا ہستی تھی! زندگی نہیں، ایک جوئے

---

[1] اس کے بعد ٹیپ میں آواز ختم تھی۔ یہ حصہ تحریر معارف القرآن جلد سوم کے عنوان تلک الرسل کے آغاز کے الفاظ پر مشتمل ہے اور پرویزؒ (1903-1985ء) کی معروف کتاب معراجِ انسانیت کے صفحہ 32 سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1949ء میں پہلی مرتبہ فیروز پرنٹنگ ورکس میں طبع ہو کر، جے۔ بی۔ عارف پرنٹر وپبلشر کی وساطت سے ادارۂ طلوع اسلام کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

[2] Goethe, Johann Wolfgang Von (1749-1832)

رواں ہے کہ نامساعدت حالات و ناموافقت زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔

در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب
واکرد چشم شوق بہ آغوش کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرام او
سیمائے اوچوں آئینہ بے رنگ و بے غبار

اُس کی رفتار پتھروں کے ریزوں سے نغمے پیدا کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور اُس کی پیشانی جلوت مآب بے رنگ و بے غبار تھی۔ الغرض یہ جوئے رواں نہ صرف ہجوم تزاحم اور انبوہِ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادیٔ رنگ و تعطر اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک نگہہ تبسم آلود ڈالتی کج کلاہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عقیدت:

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود ❶

میں نے لکھا کہ یہ مست خرام جوئے بار دشت و صحرا میں زمین صالحہ کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک اور ہر کشت زبوں حال کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ گاہ اپنی سکوت افزا روانیوں سے سبزہ نو دمیدہ کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی، اور گاہ کف برد ہاں طغیانیوں سے بڑے بڑے سرکش تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ❷ (48:29) این و آں سے بے نیاز، ماحول سے مستغنی، گرد و پیش سے غیر متاثر، اپنی خودی میں مست، انسانوں کے خود ساختہ قوانین وضوابط سے بے رخی برتتی اور صرف اس قانون سرمدی کا اتباع کرتی، جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی، جانب منزل بڑھتی گئی۔ گوئٹے ❸ (1832-1719ء) کہتا ہے ؎

دریائے پر خروش زبند و شکن گزشت

---

❶ اس بے کراں سمندر کے اندر وہ لہر کس قدر مستانہ انداز سے چلی آ رہی ہے۔ اپنی ذات کے اندر یگانہ دوسروں سے بیگانہ ہے۔

❷ محمد رسول اللہ اور ان کے رفقائے کار کی جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہم گر بڑے ہی نرم اور ہمدرد (5:54) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ اس نے کہا ہے کہ

That man is dead even in this Life--- who has no belief in another. (Quoted by Dixon in "The Human Situation. P.428)

ان گھری ہوئی وادیوں کے اندر سے چیرتی ہوئی گزری.....

یکساں چوں سیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گزشت

مساواتِ محمدی۔ پانی کا کام یہی ہے کہ جہاں گڑھا ہوتا ہے اس کو بھی بھرتا ہے' جہاں فراز ہوتا ہے اس کے اوپر سے اس کی سطح ہموار ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ جو تعلیم محمدی تھی یہ اس طرح سے نشیب و فراز کی سطح کو ہموار کرتی ہوئی طبقات کو مٹاتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اس نے نہ تو بادشاہوں کی طرح کسی سے خراج وصول کیا' نہ کسی باغبان کی طرح اپنا حصہ ان کی محنتوں سے یا چمن کے پھلوں سے مانگا۔ بے تاب وتند، تیز وجگر سوز و بے قرار۔ کیا کہوں' میں اس نعمت میں!

بے تاب و تند وتیز و جگر سوز وبے قرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

دورِ کہن میں جو چیزیں خستہ ہو چکی ہوئی تھیں' ان کو چھوڑتے ہوئے' جدید دنیا کی منزلیں طے کرتے ہوئے' آگے بڑھتے گئے۔

زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

تو میں نے پھر دیکھا کہ یہ قافلہ رشد وہدایت' یہ کاروانِ نور ونکہت' ہر ناقۂ بے زمام کو دعوت قطار دیتا اور ہر ہر سفر حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا' اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں آثارِ منزل نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ تکمیل سفر کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم شکستہ پا کیا لگا سکتے ہیں' نہ جن کے قدم آشنائے جادہ' نہ آنکھیں شناسائے منزل۔ اس والہانہ حقیقت کا پوچھیے کسی ایسے قلب زندہ سے' جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ، حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہ کیف' یہ ہر ہر وشوق' اس وقت میقات میں آ پہنچا ہے۔ مجھے خوشی ہے' مسرت ہے اور فخر ہے اپنی میقات کی اس تشبیہ پر۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب حج کے لیے جاتے ہیں تو کعبہ سے دُور کچھ فاصلے پر' کچھ یہاں کچھ وہاں' وہ مقامات کے ایسے نشانات ہیں کہ جہاں پہنچ کر پھر احرام کا جامہ پہنا جاتا ہے' تو وہ درحقیقت حرم تک پہنچنے کی تیاری ہوتی ہے' وہ کسی کے ملنے کا میقات ہوتا ہے' وہ وعدہ ہوتا ہے' وہ مقام ہوتا ہے جہاں کوئی کہہ گیا ہو کہ یہاں کھڑے رہنا' ہم یہاں تمہارے لیے آئیں گے۔ کیا بات ہے اس لفظ کی صاحب! ہم تمہیں ملنے آئیں گے' یہاں ہمارا انتظار کرنا۔ میقات کیا عجیب الفاظ ہیں! کہا کہ اس وقت یہ میقات میں پہنچ چکا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ وہ دیکھیے! ہر فردِ کارواں مصروف احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریم کعبہ میں ہوگا۔ میقات پر پہنچ کر ہر زائر حریم قدس کا ولولۂ شوق تیز تر اور راحلۂ عنان ذوق گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا قرب اور عید نظارہ کی کشش اس کے رگ وپے میں بجلیاں بھر دیتی ہیں لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم ہوتا ہے کہ ذوق وشوق کی برق آسا بے قراریاں اور جذب وکیف کی والہانہ سرمستیاں یکسر حیرت بن جاتی ہیں کہ یہ وہ مقام ہے

جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

اس آسمان کے نیچے یہ وہ ادب کا مقام ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہوتا ہے صاحب! اور یہی وہ مقام ہے یا یہی وہ کیفیت ہے کہ جہاں میں انتیسویں پارے کی آخری آیت میں پہنچا کرتا ہوں بعینہٖ یہ میری کیفیت ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! میں جذباتی بہت کم ہوتا ہوں لیکن یہ ہے وہ کیفیت جو میں نے عرض کیا کہ یہ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ [1] (77:50)۔

انتیسویں پارے کی آخری آیت اور میقات کا سنگ میل:

جب انتیسویں پارے کی یہ آخری آیت آتی ہے تو میں اسے میقات کے سنگ میل سے پکارا کرتا ہوں۔ ہم وہاں پہنچ چکے ہیں۔ احرام باندھیے' اب آگے حریم کعبہ میں پہنچنے کے لیے تیاری کیجیے۔ قرآن کا تو جیسے میں نے عرض کیا ہے آخری آیت کے آخری لفظ پہ میں تو یوں کیا کرتا ہوں: الناس الحمدللہ۔ اس اختتام سے میں ابتدا کر لیا کرتا ہوں۔ اسی طرح سے میں نے اس کا مطالعہ اور تلاوت کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ کہنے کو تو بہت سے اشعار ذہن میں آ رہے ہیں لیکن زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ جگر [2] کا ایک شعر حسین ہے۔

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

کیا کیفیت ہے اس کی! میں اسے محسوس کرتا ہوں کہ میں انتیسویں پارہ کو ختم قرآن کرتا ہوں تو میری وہ کیفیت ہوتی ہے۔ وہاں پہنچتے ہی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی بات نہیں' محبت کا زمانہ آ رہا ہے اور پھر اُسی وقت شروع ہو جاتا ہے اور اس شروع ہونے کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ غالب [3] جس انداز میں بات کہہ گیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

تیرا رخصت ہونا اور تیرا آ کر ملنا دونوں کی لذت ہی الگ الگ ہوتی ہے۔ ہزار بار بروصد ہزار بار بیا۔ ہزار بار جا' سو ہزار دفعہ آ، قرآن کی کیفیت عزیزانِ من! میرے ساتھ یہ ہے: وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد۔ ختم کرتا ہوں' ختم کے لفظ پر بھی میں کانپتا ہوں جب میں یہ کہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ لفظ بھی ختم کروں۔ آخری پارے میں پہنچنے کے بعد آخری آیت پہ جاتا ہوں تو الناس ''وداع'' اور پھر الحمدللہ سے وصل۔ وداع و وصل جداگانہ لذتے

---

[1] ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لاتے تو ان سے پوچھو کہ اس کے بعد وہ کون سی بات ہوگی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں گے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز' ص 1402)

[2] جگر (1960-1890ء)۔ علی سکندر نام اور جگر تخلص۔ مراد آباد میں 1890ء میں پیدا ہوئے۔ [3] غالب مرزا اسداللہ خاں (1869-1797ء)

دارد۔ اس شخص ❶ کی کیا بات ہے کہ ہزار بار بر و یہ ہے' لطیف جو چیز کہنے کی ہوتی ہے! جاؤ صرف ہزار بار جبکہ آؤ صد ہزار بار! میں کہوں گا کہ اس کے بعد جب وہ آتا ہے تو وہ ایک نئی دنیا کے دروازے کھولتا ہے۔ پچاس برس ہو گئے عزیزانِ من! کتنی چھوٹی سی یہ کتاب ❷ ہے کہ میرے ہاں وہ لگا ہوا ہے' یہ ایک قطعہ ہے' جس کا اتنا بڑا فریم کیا ہوا رکھا ہوا ہے۔ یہ مصر میں طبع ہوا ہے اور اس میں سارا قرآن لکھا ہوا ہے۔ یہ کتنی چھوٹی سی کتاب ہے کہ یہ چند صفحوں میں کتاب آ سکتی ہے لیکن کیفیت اس کی یہ ہے کہ نہ حد اس کے آگے' نہ حد سامنے' یہ ختم ہی نہیں ہونے کو آتی' جب میں ہر بار اس کو شروع کرتا ہوں' ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ پچاس سال ہو گئے۔ رجسٹر میرے ان چیزوں کے لکھنے سے رجسٹر بھرے ہوئے ہیں۔ لفظ ختم نہیں ہوتا۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ خدا کے حقائق کو تم ختم نہیں کر سکو گے خواہ سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں۔ قرآن کی کیفیت یہ ہے' عزیزانِ من! بہرحال ہم میقات پر آ گئے۔ اس میں احرام باندھنے میں مصروف ہو جایئے۔ آئندہ ہم میقات کے بعد کی جو پہلی منزل حریم کعبہ کی طرف جا رہی ہے۔ وہ تیسواں پارہ ہے' ہم اس تیسویں پارے کی ابتدا کریں گے۔ میں اس کے مطابق یونہی کیوں نہ کروں کہ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ❸ (77:50) ۔عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ (78:1) کیا انداز ہے اس تیسویں پارے کی پہلی آیت کا! عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ (78:1) اے رسول ﷺ! یہ کس بات کے متعلق تم سے بار بار پوچھتے ہیں؟ کون سی بات ہے جس کی بابت یہ پوچھتے ہیں؟ اس کا جواب ہم آئندہ درس میں دیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

(ماخوذ ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ: مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام 25 بی گلبرگ 2، لاہور)

---

❶ غالب مرزا اسداللہ خاں (1869-1797ء)

❷ یہ اشارہ قرآنِ کریم کی طرف ہے جو صاحبِ درس کے کمرے میں مکمل طور پر ایک کاغذ کے فریم میں آویزاں ہے۔

❸ ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لائے تو ان سے پوچھو کہ اس کے بعد وہ کونسی بات ہوگی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں گے؟ (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ) یہ لوگ' ایک دوسرے سے' کس چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟ (2۔3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

سانحہ ارتحال

بصد افسوس اطلاع دی جاتی ہے کہ پرویز اور اقبال علیہم الرحمۃ کے ایک اور شیدائی چوہدری عبدالعزیز صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ مرحوم کی ساری عمر یورپ میں بسر ہوئی اور وفات لاہور کے کارڈیالوجی سنٹر میں ہوئی۔ دُعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل۔ ادارہ مرحوم کے اعزہ و اقربا اور دوستوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	----	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	28 واں پارہ (مکمل)	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم			
سورۃ النور	(24)	264	350/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ زرِ شرکت

سالانہ زرِ شرکت اندرونِ ملک -/550 روپے، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک -/800 روپے

بیرونِ ملک -/2500 روپے، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک -/5000 روپے

Bank Account Idara Tolu-e-Islam (National Bank of Pakistan Main Market, Gulberg Lahore)

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب المراسلات

پچھلے ماہ کے شمارے میں باب المراسلات میں مَیں نے اپنی بھتیجی بریگیڈیئر (ر) لبنیٰ حفیظ اور میجر جنرل سہیل حفیظ کے بیٹے رضا حفیظ اور بیگم و میجر جنرل (ر) شاہزادہ عالم کی بیٹی شانزہ کے نکاح کی تقریب پر اپنی تحریر پر عورت و مرد کو قرآن کی نظر میں یکساں درجہ پر رکھنے کے موضوع پر روشنی ڈالی تھی۔ اُس کے بعد مزید استفسارات موصول ہو رہے ہیں۔

پہلا استفسار یکساں سلوک نہ رکھنے کے حق اور جواز میں عورت کی وراثت میں مرد کا آدھا حصہ متعین کرنے کی دلیل دی گئی ہے۔ ہم یہاں اِس دلیل کی حکمت کو قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جواب:

میاں بیوی کے درمیان تقسیم کار کی رو سے وراثت کی تقسیم کی وضاحت:

میاں بیوی دونوں اپنی الگ الگ شخصیتوں کے مالک اور بطور انسان کے یکساں تکریم و حقوق و واجبات کے حامل ہونے کی بِنا پر ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوتے ہیں۔ تقسیمِ کار کے ضِمن میں البتہ قرآن نے فیملی کے لئے رزق مہیا کرنے کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34)

''عورتوں کو رزق بہم پہنچانا مردوں کی ذمہ داری ہے''

فیملی کے لئے رزق مہیا کرنے کی خصوصی ذمہ داری کی بِنا پر وراثت میں مرد کا حصہ قرینِ انصاف کے اصول کی بنیاد پر عورت سے دُگنا رکھا گیا ہے۔ اِس سے مرد کے برتر ہونے کا کوئی جواز نکالنا بے سود ہوگا۔ اِسے میرٹ پر تقسیمِ کار کے تناظر میں پرکھنا ہوگا۔ بعض حضرات اِس دُگنا حصہ رکھنے اور رزق مہیا کرنے کی ذمہ داری نبھانے کی بِنا پر قرآن کا عورت پر مرد کے حق کو فوقیت دینے کے عمل مترادف قرار دیتے ہیں، اور اسی ملتی جُلتی حِکمت کے نتیجہ میں عورت کی گواہی کو بھی مرد سے آدھا رکھنے کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا اِس کا تفصیلی تجزیہ لینا ضروری ہو گیا ہے۔

عورت کی گواہی قرآن کی روشنی میں:

قرآن کے درجِ بالا وراثتی تناظر میں قرآن سے غلط طور پر منسوب کر کے ایک مرد کی گواہی کو دو عورتوں کی گواہی کے برابر درجہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (2:282)

ایسے (مالی) معاملات کے وقت، اپنے میں سے، دو مَردوں کو بطور گواہ ٹھہرالیا کرو۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں، تو (فریقین کی رضامندی سے) ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلالو۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ اگر ایک عورت کو کچھ مغالطہ لگ جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

اِس آیت سے دوسری عورت کی صرف پہلی گواہ کو ضرورت پڑے تو اسے صِرف یاددہانی کے فعل سے مُختص کرنے سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی گواہی آدھی نہیں، پوری ہے۔

اِس آیت میں لین دین کی بات کا ذکر ہو رہا ہے، جو زیادہ تر مردوں کے درمیان ہی طے پاتے ہیں۔ اِس تناظر میں قرآن نے کہا کہ گواہی کے لیے دو مرد نہ ملیں، ایک ہی ملے، تو دوسرے کی جگہ دو عورتیں لے لیا کرو۔ گواہی کے وقت ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں عدالت میں کھڑی ضرور ہوں گی، لیکن گواہی ایک ہی عورت دے گی۔ دوسری عورت تب بولے گی جب اسے محسوس ہو کہ گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ مغالطہ لگ رہا ہے، تو دوسری اصلاح کر دے گی۔ اگر گواہی دینے والی کو کوئی مغالطہ نہیں لگ رہا ہے، تو ساتھ کھڑی ہوئی عورت خاموش رہے گی۔ چونکہ عورتیں عموماً لین دین سے دور ہی رہتی ہیں، آج بھی اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے اور عدالتوں میں جانے کا انہیں واسطہ بھی نہیں پڑتا، اس لیے کہا کہ دو عورتیں گواہ کر لو۔ لیکن گواہی تو ایک ہی دے گی۔ اس لیے عورت کی گواہی آدھی قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ یہ پوری گواہی ہی کہلائی جائے گی۔

عورتوں اور مردوں کا یکساں درجہ کے ممکن ہونے پر ایک اعتراض یہ بھی سامنے آتا ہے کہ عورت کے لئے پردہ میں رہنے کا حکم ہے، جبکہ مردوں کے لئے ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔ پردہ کا مقصد یہی لیا جاتا ہے کہ اِس سے کوئی بھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ پردہ کے اِس مقصد کے حصول کے لئے پہلے مرد کو حکم دیا گیا ہے اور بعد میں عورت کو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ پردہ صِرف عورت کی ذات تک محدود ہے، صحیح بات نہیں ہو گی۔ قرآن نے ہدایت کی ہے کہ

30۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (24:30)

مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ انسانی ذات کی نشوونما کرنے کے لئے بہترین طریقہ ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات خوب جانتا ہے کہ تم نے احکام کی پابندی مصنوعی انداز میں کی ہے (یا دل کی گہرائیوں سے)۔

31۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ

اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ‌ۖ وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ‌ؕ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (24:31)

مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اپنی زینت و آرائش کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، سوائے اس کے کہ جس قدر چلتے پھرتے از خود ظاہر ہو جائیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے اوڑھنے کی چادروں کو اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈال لیا کریں۔ اِس کے لئے (33:59) میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ يُدۡنِيۡنَ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِيۡبِهِنَّ‌ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَنۡ يُّعۡرَفۡنَ فَلَا يُؤۡذَيۡنَ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا (33:59)

اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے، اور مومنوں کی عورتوں کو تاکید کر دے کہ وہ باہر نکلیں، تو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں، (جس سے زینت نمایاں نہ ہو (24:31)) ۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں)، اور کوئی بدقماش انہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز ان کے لئے قانون خداوندی کی رو سے حفاظت اور تربیّت کا موجب بن جائے گی۔

عوتوں کو اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر کشادہ چغہ Overall یا چادر لینے اور عصرِ حاضر میں حجاب کے نام سے پہچانے جانے والی اوڑھنی (نہ کہ پورا چہرہ برقعہ میں چھپانے) کی غرض و غایت خدا نے یہ بتائی کہ

(1) پہچانی جا سکیں کہ کوئی اوباش عورت یا عورتیں نہیں جا رہی ہیں، بلکہ یہ شریف بیبیاں ہیں؛

(2) کوئی بدقماش شخص انہیں نہ چھیڑ سکے؛

(3) اس روش کو اپنانے سے ان میں حفاظت کا احساس ابھرے گا، اور

(4) حفاظت کے احساس سے انہوں میں عصمت کی حفاظت کی تربیّت ہو جائے۔

خدا نے چغہ، یا چادر یا ایک کشادہ لباس پہننے کی غرض و غایت یہ بتائی تا کہ اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں، سوائے اپنے شوہروں کے سامنے، یا اپنے باپوں کے سامنے، یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے، یا اپنے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے بھائیوں کے سامنے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے، یا اُس زمانے میں اپنے غلام (لونڈیوں) کے سامنے، یا ایسے بوڑھے خدمت گار مردوں کے سامنے، جو جنسی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں، یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ چیزوں (جنسیات) سے لاعلم ہوں۔ اور چلتے وقت عورتیں اپنے پاؤں اس زور سے زمین پر مار کر نہ چلیں کہ زیورات کی جھنکار

سے معلوم ہو جائے کہ کیا پہن رکھا ہے۔ اور اے ایمان والو! (مرد و عورت) سب مل کر اللہ کے قوانین کی اطاعت کرو تا کہ تمہیں زندگی کی کامرانیاں نصیب ہوں۔

آداب معاشرت سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات دینے کے بعد قرآن نگاہوں کی حفاظت اور تحفّظِ عصمت کی طرف آ گیا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ قرآن محض سزاؤں پر زور نہیں دیتا، بلکہ وہ پہلے حفاظتی تدابیر بیان کرتا ہے تا کہ جرم سرزد نہ ہونے پائے۔ عصمت و عفّت کو خطرہ نگاہوں کے ذریعے ہوتا ہے، اس لئے تم اپنی نگاہوں کو بے باک مت ہونے دو۔ انسانی ذات کی نشوونما قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے آپ تزکیہ کہتے ہیں۔ نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دینے کا حکم پہلے مردوں کے لئے ہے اور بعد میں عورتوں کے لئے ہے۔ ہم سارا الزام عورتوں پر رکھتے ہیں۔ اگر مرد آگے نہ بڑھے تو عورت کیا کرلے گی؟ حضرت یوسف کا واقعہ ثبوت کے لئے کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ (24:30) اگر مصنوعی انداز میں آنکھیں نیچی کر بھی لو گے، لیکن دل میں پاکیزگی نہیں ہے، تو خدا خوب جانتا ہے کہ کیا کچھ تم مصنوعی انداز میں کرتے ہو اور دل میں تمہارے کیا خباثتیں بھری ہوئی ہیں۔

آیت (24:31) میں نگاہوں کو بے باک نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ ہی زیبائش اور زینت کے بارے میں بھی تاکیدیں دے دیں۔

ظہر لفظ کے معنی ہیں، وہ نمود و نمائش جو بغیر ارادے کے از خود ظاہر ہو جائیں یعنی چلتے چلتے آستین اوپر چڑھ جائے، پلو ہٹ جائے یا سر سے کپڑا بغیر ارادے کے سرک جائے، تو یہ قرآن کی رو سے ''الّا ما ظھر'' والی بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے زیبائش و آرائش ظاہر کرنے میں کوئی ارادہ شامل ہے تو یہ الّا ما ظھر میں نہیں آئے گا، یہ بالارادہ نمود و نمائش میں آجائے گا، جسے منع کیا گیا ہے۔ منع اس لئے کیا گیا ہے کہ زیبائش و آرائش کی اگر بالارادہ نمائش ہوگی، تو نمود میں تسلسل ہوگا اور یہ بات مردوں کے لئے کشمکش کا باعث بنے گی۔ اس آیت میں تویید ہے، لیکن ایک دوسری آیت میں لفظ تبرج (33:33) میں یوں سامنے آتا ہے کہ:

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ (33:33)

اور تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو (تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہو)۔ اور جب تم باہر جاؤ تو اپنی زینت کی نمود و نمائش نہ کرو، جیسا کہ، قرآن سے پہلے عہد جاہلیّت میں عورتیں کیا کرتی تھیں (یعنی کوئی حرکت ایسی نہ کرو، جو مردوں کے جذبات میں اضطراب و تلاطم پیدا کرنے کا موجب بنے (24:31-40)۔ تم نظام صلوٰۃ کو قائم رکھو۔

قرآن کہتا یہ ہے کہ نبی کے گھرانے کی عورتیں وقار سے گھر میں رہیں۔ نمود و نمائشِ حسن کا جذبہ کبھی تمہارے دلوں کے اندر نہیں آنا چاہیے۔ یہ اس لئے نہیں کہا گیا ہے کہ مردوں کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کی پاکیزگی مطلوب ہے۔ وہ ایمان ہی کیا، جو دعوتِ نظارہ سے خطرے میں پڑ جائے۔ عورتوں میں نمود و نمائش کا جذبہ ابھارنے کا

سبب مروّجہ تفاسیر ہیں، جن میں لکھا ہے کہ ''حوّا'' کو آدم کا دل بہلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی پیدائش مقصود بالذّات نہیں ہے۔ جب دماغوں میں یہ بیٹھ گیا کہ عورت کا وجود محض مردوں کا دل بہلانے کے لئے ہے، تو پھر عورت میں یہ جذبہ جاگ گیا۔ حالانکہ عورت کی مرد کا طرح اپنا ایک تشخص ہے، اپنی ایک پرسینلٹی ہے اور وہ اُن تمام صفات کو اپنے اندر پیدا کرسکتی ہے، جو مردوں میں ہیں یا پیدا ہوسکتی ہیں۔

تبرج: کا مادہ ہے ''ب رج'' برج اور ترجمہ ہے ابھار۔ زیبائش وآرائش کو ابھار کر دکھانا، نمود ونمائش کا جذبہ ہے، جس کو منع کیا گیا ہے۔ تبرج وہ ذہنیّت ہے، جس کے تحت زینت وآرائش کو ابھارا جاتا ہے۔ بہرحال قرآن نے زیب وزینت اور آرائش کی چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔ قرآن تو بس نمود ونمائش کے جذبے کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو عورتوں کے بارے میں مردوں کا پیدا کردہ احساسِ کمتری ہے کہ ''عورت ناقص العقل ہے، کام نہیں کرسکتی''، جس کے سبب عورت مرد کی نگاہ میں جاذبِ نظر بننے کی طرف راغب ہوتی ہے۔ ویسے تو میاں بیوی ایک دوسرے کے رفیقِ حیات ہوتے ہیں اور دونوں میں ہم دوش چلنے کی پوری پوری صلاحیّتیں ہوتی ہیں۔ جنس کے اعتبار سے خدا نے کسی کو غالب اور کسی کو پست نہیں بنایا ہے۔ خدا نے اس لئے عورتوں کو نمودِ حسن سے منع فرمایا کہ اس سے خواہ مخواہ عورت اپنے آپ کو کمتر درجے کی سمجھنے لگ جائے گی۔

ہمارے ہاں عورت کے مقام کو پیدائش ہی سے نہایت ہی پست اور اضافی پوزیشن کا درجہ دیا جاتا ہے، جس میں بیوی کو اپنے شوہر کا ہر لحاظ سے محکوم اور تسکین پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس پیدائشی تصور کے ضمن میں نظریہ ارتقاء کے تحت بُہت تحقیق ہوچکی ہے، جس کے قدیم اور جدید نظریہ کا مُختصر طور پر تجزیہ یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

قدیم مذہبی نظریہ ارتقاء:

چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، جب قرآن کی ہمیں راہنمائی ملی، بلکہ اُس سے بھی بہت پہلے تورات اور دیگر مذاہب کی سب ہی کتابوں میں ارتقاء کا تصور نہیں ملتا۔ اُن سب میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کہا " کُن" اور یہ کائنات وجود میں آگئی۔ یعنی جس طرح سے جو چیزیں آج ہمیں نظر آتی ہیں، کُن سے یہ سب چیزیں اِسی شکل میں پیدا ہوگئیں، اور اِسی شکل میں اُسی طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آرہی ہیں۔ تین سو سال پہلے تک ہمارے ہاں حکماء کا بھی تصور یہی تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں، وہ اِسی شکل میں سامنے آگئیں۔ خود آدمی کے متعلق تو یہ بہرحال تورات اور دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ خدا نے پہلے ایک آدمی کو پیدا کیا اور پھر اُس کے بعد اُس کی پسلی سے مرد کو سکون پہنچانے کی وجہ سے عورت کو پیدا کردیا۔ ہماری تفسیری روایات میں اِسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ زیبِ داستان میں یہ بھی اضافہ کیا گیا کہ پسلی چونکہ ٹیڑھی ہوتی ہے اس لئے عورت کی سرشت ہی میں ٹیڑھا پن شامل ہوتا ہے اور اس کا سیدھا کرنا ناممکن ہے۔ اِس لئے کہ پسلی کو سیدھا کرنے کے عمل میں وہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ مکتبِ مُلا کو تو موقعہ کی تلاش ہوتی ہے تو اُس نے قرآن سے تفسیری روایات کا سہارا لے کر یہ فتوٰی بھی صادر کردیا کہ آدم کو جنت سے نکالے جانے کی وجہ حوا کا آدم کو بہکانے کا عمل تھا۔ اُن کو یہ توفیق بھی نصیب نہ

ہوئی کہ وہ قرآن کی متعلقہ آیت سے ہی وضاحت لے لیتے کہ:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ (2:36)

شیطان یعنی مفاد پرست جذبات نے ان دونوں (مرد اور عورت) کے ارادے کو مفاد پرستی کے سبز باغ دکھا کر پھسلا دیا، انسان کو فہم و عقل کی استعداد دی گئی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی علمی سطح پر پرکھ کر اِسے کام میں لائے۔ لہٰذا یہاں جدید نظریہ کو بھی سامنے لایا جا رہا ہے۔

انسانی پیدائش کا جدید نظریۂ ارتقاء:

کوئی تین سو سال پہلے سائنس نے یہ بات بے نقاب (Discover) کی کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے، یہ پہلے دن سے اِس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ ہر شے کا آغاز پست ترین درجے میں ہوا۔ ہر شے ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی، موجودہ شکل میں پہنچی۔ پہلا نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اِس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکی ہے، نہ کہہ سکے گی۔ اِس لئے سائنس دانوں نے یہ کہا کہ کسی نہ کسی طرح اتفاق سے یہ وجود میں آ گئی۔

ذہن انسانی، اب تک حیات کے ارتقاء کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے، اُسے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

نظریہ ارتقاء کا مختصر طور پر جائزہ:

1۔ ارض پر زندگی (Life) کی ابتداء پانی سے ہوتی ہے۔

2۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولین کو پیکر عطا ہوا۔

3۔ زندگی کے یہ سالمے جوشِ نمو میں مختلف نوعوں (جس میں نر و مادہ بھی شامل ہے) میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

4۔ اِن پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

5۔ ان طویل المعیاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا، جسے تخلیق بذریعہ تولید کہتے ہیں۔

6۔ حیوانی زندگی اِسی قسم کے غیر محسوس، اور طویل المعیاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

انسانی پیکر کی یہاں قرآن سے مزید ارتقاء کی راہ نمائی ہمیں قرآن سے یوں ملتی ہے کہ

7۔ انسانی پیکر میں آنے کے بعد اِس میں مزید ارتقاء کے لئے، اِسے بشریت کی حد تک علم کی صلاحیت ودیعت کرنے کے ساتھ اختیار و ارادہ میں آزادی سے انتخاب کی قوت دے کر انسانی ذات کے نام سے اِس ارض میں ایک نئی تخلیق کے طور پر متعارف کرایا گیا۔

8۔ نشوونما یافتہ انسانی ذات کا مزید ارتقاء موت کے بعد نئی اور اس سے بہتر حیات کے حصول کے لئے امیدوار بن کر ہوگا۔ یہ زندگی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت سے نوازی جائے گی۔

قرآن سے (5:32) یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ یہ سب ارتقاء کے مراحل یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو رہے بلکہ ایک مقصد کے تحت ایسا ہو رہا ہے۔ یہ مقصد محض مقصد ہی نہیں بلکہ یہ مقصد ایک خود شناس شعور اور ایک خلاق، قادرِ مطلق خدا کی ذات کا طے کردہ ہے، جو اِس مقصد کی اصل حقیقت اور قوت کے طور پر ادراکِ انسانی سے باہر ہے۔

اسلام میں عورت کو پست درجہِ مقام کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اِس میں عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا اِس کا تجزیہ کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔

اسلام میں غلام اور لونڈیوں کے رکھنے کے اعتراض کا تجزیہ:

اسلام سے پہلے، اور جب اسلام آیا، تو ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ خود مکہ کی 75 فیصد آبادی غلاموں اور لونڈیوں پر مشتمل تھی۔ یہ غلام اور لونڈیاں جنگ میں ہاتھ لگنے والے قیدی ہوتے تھے۔ ان کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی، پھر ان کی تجارت ہوتی تھی۔ غلامی پر موثر اعتراض زمانہِ جاہلیت کے عرب کا اوپر کا طبقہ کر سکتا تھا، لیکن اُنہوں نے دنیاوی مفاد کے تحت انصاف کرنے کے عمل کی طرف دھیان نہیں دیا۔

قرآن نے آ کر اعلان کیا کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) تمام نوعِ انسانی (نر و مادہ) پیدائش کے اعتبار سے ہی یکساں تکریم و احترام کے مستحق ہیں۔ بنی آدم میں تو سبھی نر و مادہ سمیت پوری نوعِ انسانی ہوتی ہے۔ دین کا ما حاصل تو شرف اور اکرام انسانیت ہے، تو دین الاسلام میں غلامی کا تصور کہاں سے آئے گا؟

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب اقوام میں جنگ جیت کر مالِ غنیمت میں قید ہونے والوں کو لونڈی اور غلام بنا کر تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور بالآخر اِن کی معاشرہ میں آمد کا یہ فرمان دے کر آئندہ کے لئے چور دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا کہ:

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ (47:4)

''قیدیوں کو فدیہ تاوانِ جنگ یا قیدیوں کے تبادلہ کی صورت کے فدیہ کے عوض چھوڑ دو اور یا فدیہ لیے بغیر احساناً چھوڑ دو یہاں تک کہ جنگ خود اپنے ہتھیار پھینک دے۔ اب اگر ایسی حالت ہو کہ تمہارے قبضے کی وجہ سے جنگ کا تاوان دینے والی حکومت ہی نہ بچے یا کسی کا فدیہ ادا کرنے والا کوئی نہ ہو، تو ایسے حالات کے لیے کہا فاما منّا (47:4) ان کو احسان کے طور پر چھوڑ دو''۔

قرآن کریم کی یہ ایک ہی آیت ہے، جس میں قیدیوں کو چھوڑنے کے دو طریقے بتائے:

(1) فدیہ لے کر اور یا

(2) احساناً ان کو چھوڑ دو۔

لہٰذا اِس طریق سے اب کسی کو غلام بنانے کی اجازت نہیں رہی۔ اس زمانے میں قیدیوں کے لیے الگ کیمپ نہیں تھا

اس لیے قیدیوں کو مہمانوں کی طرح گھروں میں رکھنے کے لیے تقسیم کیا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں دوسرے مزدور تو تھے نہیں، یہی غلام اور لونڈیاں ان کے کام کرتے تھے۔ اتنے مردوں، عورتوں اور لڑکیوں کو معاشرہ سے نکال دیا جاتا، تو نہ وہ گھر میں رہتیں اور نہ باہر غلامی میں، تو اِس کے نتیجہ میں ظاہر ہے کہ معاشرہ ابتر ہو جاتا۔ قرآن نے حکمت سے یوں کام لیا کہ پہلے تو قیدی بنانے کے لئے جو ایک ہی سرچشمہ تھا، اُس کو یہ حکم دے کر بند کیا یعنی جنگ میں قیدی کو ہر حال میں آزاد کرنے کا حکم دیا۔

پھر بات بات پر کفارہ کے طور پر غلام اور لونڈیوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ غلام اور لونڈی کو آزاد کرنے کو صدقہ قرار دیا اور اس کو فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) کہہ کر بہت بڑا کارِ خیر بتایا گیا کہ دوسروں کی گردنوں کو آزاد کراؤ اور انہیں سرفراز کرو۔ پھر غلاموں کی رہائی کیلئے مکاتب کا حکم دیا۔ قرآن نے کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کو مکاتب کہا ہے کہ یہ قرض ہے اسے لکھ لو۔ پھر لونڈیوں کو بیویوں کا سا درجہ دینے کے لیے احکام نازل کیے تاکہ یہ معاشرے میں ضم ہو جائیں۔ ان کو گھروں میں رکھو گے تو ان کا درجہ بیویوں جیسا ہوگا، ان کی اولاد ہوگی، تو وہ تمہاری اولاد ہوگی، وہ تمہاری وراثت میں بھی حق دار ہوگی۔ ویسے بھی جہاں قرآن میں اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ الفاظ آئے ہیں، وہ ماضی کے صیغہ میں ہیں، یہ کہیں بھی مستقبل کے صیغے میں نہیں ہیں۔

بیویوں اور لونڈیوں کی الگ الگ دو اصطلاحوں کو کیوں باقی رکھا گیا؟:

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن مجید کی نگاہ قانون کی نسبت سے تعزیرات اور سزا دینے کے معاملہ میں کہاں تک پہنچی ہے۔ زمانہ اگرچہ بہت گزر چکا ہے، لیکن آج بھی دیکھ لیں کہ گھروں کے اندر کام کاج کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی ذہنی تربیت اس معیار کی نہیں ہوتی، جیسے ہماری بیٹیاں اور بیٹے تعلیم حاصل کر کے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ دونوں کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ غلامی ختم ہونے کے بعد اب اَو ما مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اپنے معانی کے اعتبار سے بھی مراد آپ کے ماتحت کام کرنے والے اور غلام اور لونڈی کی اصطلاح میں گھروں میں کام کاج کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، جن کی ذہنی سطح، کام کاج لینے والوں کے بچوں سے پست ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے اندر پہچاننے کے لیے، قرآن کریم میں، بیویوں اور لونڈیوں کی الگ الگ اصطلاحات رکھی گئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی جرم کی سزا دیتے وقت، مجرم کی ذہنی سطح کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ مثلاً آزاد عورتوں کی زنا کے جرم میں جو سزا ہے، اس سے آدھی لونڈیوں کی سزا قرآن تجویز کرتا ہے، کیونکہ لونڈیوں اور غلاموں کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی۔

میری پوسٹ کے ردِّعمل کے جواب میں مجھے محترم اقبال صاحب کی طرف سے بھی مردوں اور عورتوں کے یکساں حقوق و فرائض رکھنے کے موقف کے بالمقابل میں روایتی مکتبِ مُلا، جن میں اب ہماری اسلامی نظریاتی تحقیقی کونسل کا ادارہ بھی شمولیت اختیار کر چُکا ہے، کے موقف کے دفاع میں ایک تفصیلی مراسلہ موصول ہوا۔

اس میں اُنہوں نے قرآن کے حوالہ سے مرد وعورت کے تعلقات پر یوں روشنی ڈالی کہ اسلام میں عورت کو مرد کیلئے ایک ایسی چیز قرار دیا گیا ہے، جس کا مقصد مرد کی جنسی خواہش کی تسکین اور اولاد پیدا کرنا ہے۔ قرآن کے مطابق عورتیں کھیتیاں ہیں اور مرد کسان ہیں۔ اور انہیں ان کھیتیوں کو اپنی مرضی سے" کاشتکاری" کیلئے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ

تمہاری عورتیں کھیتیاں ہیں تمہاری، سو جاؤ اپنی کھیتی میں، جس طرح چاہو (استعمال کرو) اور آگے کی تدبیر کرو تم اپنے واسطے، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ پیش ہونا ہے اس کے حضور اور خوشخبری دے دو (اے نبی) اللہ والوں کو۔ (2:223)

یہ ایک روایتی ترجمہ ہے جو سوچے سمجھے بغیر مُتقدمین کی تفسیر کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس علمی، تحقیقی اور منطقی روش اختیار کرنے اور اس ضِمن میں قرآن کی مجموعی تعلیم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اِس کا مفہوم یوں بھی لیتے ہیں۔

(اولاد کی صلاحیت مَردوں میں ہوتی ہے، جبکہ) تمہاری عورتیں تو تمہارے لیے مانند کھیتی ہیں، (ان میں اولاد کی صلاحیت نہیں ہے)، تو اپنی کھیتی میں جب دل چاہے آؤ اور اپنی نسل کو آگے بڑھاؤ اور قوانین خداوندی کی پیروی کرو اور جان رکھو کہ تمہیں ہمارے قانون مکافات کا سامنا لازماً کرنا ہے، اور قوانین خداوندی پر عمل پیرا لوگوں کو ان کے اعمال کے خوشگوار نتائج کی خوش خبری دو۔

قرآن نے عورت کے بارے میں کہا نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ کھیت میں اپنے طور پر تو کھیتی اگانے کی صلاحیت نہیں ہوتی، البتہ اس کے اندر بیج کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کسان جس جنس کا بیج ڈالے گا، وہی فصل کھیت سے اُگے گی۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ عورت میں لڑکا یا لڑکی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ عورت تو کھیت کی مانند ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے جراثیم یا بیج مرد میں ہوتے ہیں۔ جس مرد میں لڑکی اور لڑکے کے جرثومے نہ ہوں، اس کی بیوی کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا عورت کی وہی جگہ کھیتی ہے جو مرد کے نطفے کو پرورش کے لیے قبول کرے۔ کھیتی بھی کسان کے بیج کو پرورش کے لیے قبول کرتی ہے۔ حیوانات کی طرح انسان پر کنٹرول نہیں رکھا گیا، اس لیے کہا فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ "تو تم اپنی کھیتیوں میں جب دل چاہے آؤ"

یہ انسان کا اختیار وارادہ ہے کہ کھیت میں تو جب جی چاہے جائے، لیکن بیج نہ ڈالے اور جب چاہے بیج ڈالے، لیکن یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب بیوی بھی اسی وقت مرد کی طرف رجوع کرنے کے لیے تیار ہو۔ نکاح تو ویسے بھی ایک معاہدہ ہے جو میاں اور بیوی کے درمیان باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے۔ اِس میں کوئی ایک یکطرفہ طور جنسی تسکین پہنچانے کے فعل کا پابند نہیں بلکہ دو طرفہ برابر کی ذمہ داری سے نبھانے کے لئے اِس صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔

محترم اقبال صاحب نے اب اپنی شکایت کا رُخ موڑ کر نئے سِرے سے سُنت کی اصطلاح سے مرد وزن کے یکساں

درجات ہونے کے تصور پر کاری ضرب لگاتے ہوئے یوں وضاحت مانگی کہ:

محترم ڈاکٹر صاحب:۔ آپ نے قرآن اور صرف قرآن کی روشنی میں مرد و زن کی یکساں حیثیت کا تعین تو کر دیا، لیکن رسول کی سُنت جو احادیث صحاح ستّہ کے ذریعہ ہم تک دین کے بنیادی مآخذ کی شکل میں پہنچی ہے، اُسے آپ نے نظر انداز کر کے مرد و زن کی حیثیت کے اسلامی نقطہ نگاہ سے تعین کرنے میں ادھوری بات کر کے ہمیں پوری رسائی نہیں پہنچائی ہے۔

آیئے! ہم جاننے کی کوشش کریں کہ عورت کے معاشرتی و سماجی کردار کے حوالے سے پیغمبرِ اسلام ﷺ خود کیا سوچ رکھتے تھے اور اس موضوع پر امت کے لیے ان کے کیا احکامات و ارشادات موجود ہیں۔

اِس ضِمن میں قارئین سوال کنندہ نے بُہت سے اقوال ہمارے سامنے رکھے، لیکن مَیں یہاں آدھے اقوال آپ کے سامنے لا رہا ہوں جو اُنہوں نے کُتبِ صحاح سِتّہ کے حوالہ جات سے پیش کئے تھے۔

1۔ شوہر کی اطاعت ہر حال میں لازم۔

بی بی عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر آدمی اپنی بیوی کو حکم دے کہ وہ جبل احمر (پہاڑ) کو جبل اسود کی طرف منتقل کرے۔ یا جبل اسود (پہاڑ) کو جبل احمر کی طرف منتقل کرے، اس کا حق ہے کہ وہ ایسا کرے۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ، ترغیب)

2۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: "اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔" (ترمذی ج:1 ص:138)

3۔ شوہر سے طلاق مانگنے پر جنت حرام۔

حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ نبی پاک نے فرمایا: "جو عورت اپنے شوہر سے بلا کسی ضرورت شدید و پریشانی کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔" (ابن ماجہ، ابوداود، ترمذی)

4۔ خُلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "شوہر سے علیحدگی چاہنے والی خُلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے۔" (مشکوٰۃ۔ نسائی)

عورت کا گھر سے باہر نکلنا:

5۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "عورت پردہ ہے اور عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے۔ عورت کے لئے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ تقرب یہ ہے کہ وہ گھر کے کسی گوشہ میں رہے۔" (ترمذی۔ طبرانی۔ کنز)

عورتوں کا تنہا سفر کرنا:

6۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کوئی عورت سفر نہ کرے ہاں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو" (طحاوی۔ بخاری)

بناؤ سنگھار کرنے والی عورتیں:

7۔ میمونہ بنت سعدی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو عورت اپنے شوہر کے علاوہ زینت و سنگھار کر کے چلے، قیامت کے دن سخت ظلمت و تاریکی میں رہے۔" (ترمذی۔ جامع صغیر)

شوہر کے بھائی کے متعلق حکم

8۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خبردار عورتوں کے پاس آنے جانے سے بچو۔ ایک انصاری نے پوچھا دیور کے متعلق کیا حکم ہے (وہ بھابھی کے پاس نہ آئے جائے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ تو موت ہے۔" (بخاری)

قبروں، مزاروں پر جانے والی عورتیں:

9۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: "آپ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو قبروں پر جانے والی ہیں۔" (ابوداود۔ ابن ماجہ)

عبدالرحمن بن حسانؓ سے مروی ہے کہ: "آپ ﷺ نے مزاروں پر جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔" (ابن ماجہ)

عورت اور جوتی کا استعمال:

10۔ ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ: "بی بی عائشہؓ سے پوچھا گیا عورتیں جوتا پہن سکتی ہیں؟ انہوں نے کہا رسول پاک نے لعنت فرمائی ہے ان پر جو عورتیں مرد کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔" (ابوداود۔ مشکٰوۃ)

عورت کے لیے امارت و دنیاوی عہدہ:

11۔ حضرت ابوبکرہ سے مروی ہے کہ: "جب رسول اللہ کو خبر ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو تخت شاہی پر بٹھایا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنا حاکم اور والی عورت کو بنایا۔" (بخاری۔ ترمذی۔ مشکوہ)

عورتیں اور جہنم:

12۔ عمران بن حصین سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں رہنے والی عورتیں کم ہوں گی (یعنی مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ جہنم میں ہوں گی)۔" (بخاری)

عورت اور فتنہ:

13۔ اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے اپنے بعد عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کو تکلیف دہ ہو۔" (مشکٰوۃ)

ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں کے سبب سے تھا۔" (مشکٰوۃ)

عورت اور نحوست:

14۔ہم سے ابوالیمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، ان سے زہری نے بیان کیا، انہیں سالم بن عبداللہ نے خبر دی اور ان سے عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا تھا کہ نحوست صرف تین چیزوں میں ہوتی ہے۔گھوڑے میں، عورت میں اور گھر میں۔(صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2858)

15۔ابن عمر سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "نحوست تین چیزوں میں ہے۔عورت، گھر اور گھوڑے میں۔"
(مشکوٰۃ۔ابن ماجہ)

16۔عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی بیوی، خادم یا جانور حاصل کرے تو اسکی پیشانی پکڑ کر کہے: "اے اللہ میں اس کی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں۔آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے اور اس کی خلقت وطبیعت کے شر سے۔" (ابن ماجہ)

عورت کو مارنا پیٹنا:

17۔اشعث بن قیس سے روایت ہے کہ: "حضرت عمرؓ نے دعوت کے روز جب رات ڈھلنے لگی تو آپ نے کھڑے ہو کر اپنی عورت کو مارا۔ میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ جب وہ اپنے بستر پر جانے لگے تو مجھ سے کہا: یاد رکھ! نبی ﷺ فرماتے تھے کہ مرد سے اپنی بیوی کو مارنے کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا۔(ابن ماجہ)

18۔حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، رسول اللہ عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر میں عیدگاہ تشریف لے گئے۔وہاں آپ عورتوں کے پاس سے گذرے اور فرمایا، اے عورتوں کی جماعت صدقہ کرو کیونکہ میں نے جہنم میں تم کو ہی زیادہ دیکھا ہے۔انہوں نے کہا، یارسول اللہ کیوں؟، آپ نے فرمایا کہ تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو باوجود عقل اور دین میں ناقص ہونے کے۔میں نے تم سے زیادہ کسی کو بھی ایک عقلمند اور تجربہ کار آدمی کو دیوانہ بنا دینے والا نہیں دیکھا۔عورتوں نے عرض کیا کہ ہمارے دین اور عقل میں نقصان کیا ہے رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف نہیں ہے؟۔انہوں نے کہا، جی ہے۔آپؐ نے فرمایا، یہی اس کی عقل کا نقصان ہے۔پھر آپؐ نے پوچھا کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت حائضہ ہو تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے اور نہ روزہ رکھ سکتی ہے۔عورتوں نے کہا، ایسا ہی ہے۔آپ نے فرمایا کہ یہی اس کے دین کا نقصان ہے۔(صحیح بخاری، کتاب الحیض، حدیث نمبر 304)

19۔آپؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت دیکھی اور اس کا ایک خوشہ توڑنا چاہا تھا۔اگر میں اسے توڑ سکتا تو تم رہتی دنیا تک کھاتے اور مجھے جہنم بھی دکھائی گئی۔ میں نے اس سے زیادہ بھیانک اور خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا اس میں عورتیں زیادہ ہیں۔کسی نے پوچھا، یارسول اللہ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا، اپنے کفر کی وجہ سے۔پوچھا گیا کیا اپنے اللہ کا کفر (انکار) کرتی ہیں؟۔آپ نے فرمایا کہ شوہر اور احسان کا کفر کرتی ہیں۔زندگی بھر تم کسی عورت کے ساتھ حسن سلوک

کرو، لیکن کبھی اگر کوئی خلاف مزاج بات آ گئی تو فوراً یہی کہے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ (صحیح بخاری، کتاب الکسوف حدیث نمبر 1052)

درج ذیل روایت میں عورت کی صرف تذلیل ہی نہیں کی گئی بلکہ اسے ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا ہے جو مرد اپنے فائدے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں:

20۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا، عورت مثل پسلی کے ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے۔ اور اگر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہو گے تو اس کے ٹیڑھ کے ساتھ ہی فائدہ حاصل کرو گے۔ (صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر: 5184)

درجِ بالا روایات کا انتخاب ہم نے اُن صحاحِ ستّہ احادیث کی کُتب سے کیا ہے کہ جس کی ایک حدیث کا انکار کرنے پر مکتبِ مُلا کی بہت بڑی اکثریت اپنے فتاوٰی میں اُسے کافر قرار دینے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کرتی۔ اکثریت کے فیصلوں قبولیت اور پوری طرح اتباع کرنے کے حق میں خصوصاً جبکہ وہ متفقہ اور تواتر سے ہوں، سبھی ائمہ کرام کا اُس کے الحق ہونے پر اتفاق ہے۔ اِس لئے کہ اُن کی منطق میں لوگوں کی اکثریت کا گمراہی میں جمع ہونا محال ہے۔

یہی اصول آج کل سیاست میں بھی اپنایا جا رہا ہے خصوصی طور پر جمہوریت میں جس بات کا اکثریت فیصلہ سُنا دے اُسے صحیح قرار دیا جاتا ہے۔ جب امریکہ کی پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کر دیا کہ شراب ناجائز ہے تو وہ ناجائز قرار پا گئی اور اس کا استعمال حرام۔ اور جب دوسری مرتبہ وہاں کی آراء کی کثرت اس طرف چلی گئی کہ شراب جائز ہے تو شراب جائز قرار پا گئی اور اسکا استعمال حرام نہ رہا۔ گویا قرآن کی تعلیم کے برعکس الحق کی حیثیت مُطلق نہ رہی بلکہ لوگوں کی اکثریت کے بل بوتے فیصلوں کی بنیاد پر اضافی کر دی گئی۔

ائمہ صحاح ستّہ اور مغربی جمہوریت کے موقف کے برعکس ہم قرآن سے متعدد مقام پر یہ ہدایت پاتے ہیں کہ:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (6:116)

ترجمہ: اگر تم لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ زمانہِ خلافت کے مُختصر عرصہ کو چھوڑ کر نوع انسانی کی اکثریت کبھی صحیح راستے پر نہیں رہی۔

جہاں تک اقبال صاحب آپ نے رسولِ اکرم ﷺ کی سوچ اور احساسات کے موقف کو احادیث کی روشنی میں بیان کیا ہے، تو مَیں یہاں احادیث کے مآخذ پر کوئی فنی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے اسوہِ حسنہ کی پیروی کی خلاف ورزی کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا، البتہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ روایات میں بیان کئے گئے اقوال رسولِ اکرم رحمۃ لِلعالمین ہی کے ہیں، بلکہ اِس کی صحیح پوزیشن یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ اُنہیں رسول سے منسوب کئے گئے اقوال سمجھا جائے۔ ایسے اقوال پر مبنی احادیث کے بارے میں ہمارے دینی سکالر و مفکر محترم سر سید احمد خاں اور علامہ پرویز کا موقف یہی ہے۔

سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ:

''نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف وعظمتِ انسانیت کی معراج کُبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ حضورِ کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے، اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کریم کے باہر ہے سو اس میں کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ کی سیرت پر طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ غلط ہے۔ اسے رسول کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلے میں سامنے رکھنا چاہیے۔

محترم پرویز صاحب نے بھی قرآنی تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد میں یہی موقف رکھا کہ

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اُس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس میں حضور اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

روایات کی کسی بھی حیثیت سے انکار مکتبِ مُلا کی طبعیت پر ناگواری کے تاثرات کو جنم دینے کے لئے کافی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے عُلمائے کرام کو ان حضرات کو مُنکرِ حدیث گردانتے ہوئے کافر قرار دینے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں ہوا۔

سرسید احمد خاں کو مُنکر حدیث و رسول کے اعلان میں عُلمائے کرام یہ بھی بھول گئے کہ ولیم میور کی تصنیف سے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت پر لگے ہوئے داغ دھونے کے لئے وہ قرض لے کر اور سب کُچھ پیچھے چھوڑ کر لندن چلے گئے۔ وہاں اُنہوں نے پبلک لائبریری میں برسوں وقت صرف کر کے رسولِ اکرم ﷺ کی پاکیزہ اور منزّہ سیرت کو سامنے لاتے ہوئے سر ولیم میور کی تصنیف کا رد لکھ کر سُکھ کا چین لیا۔

اِسی طرح کسی نے محترم پرویز صاحب کی پُکار پر کان دھرنے کی ضرورت محسوس نہ کی جس میں وہ برملا اظہار کرتے دکھائی دئے کہ

''میں سب سے پہلے اپنے اس ایمان کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ:۔ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوہء حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اس اسوہء حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔''

''نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی مظہر تھی۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے، اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے، سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے، انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔'' (بحوالہ طلوعِ اسلام جون 1942ء)۔

Surah *Al-Mutaffifin* (سورۃ المطففین)

Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 20

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

The Quranic wine – further explanation

We were talking about رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) – sealed pure wine – in our last lecture. This is an extremely important point that needs further explanation. As we have seen the description of heaven given in Quran is in form of allegory. Whenever the Quran describes heaven, it says: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي (13:35) – the example of heaven is ... It is a known fact that Arabs did not have a book of prose before the Quran. But they had poetry. In fact, they were drowned in poetry just as they were drowned in wine. Poetry and wine were as if conjoined twins of Arab culture of that time. Wine was a metaphorical symbol of warmth, energy, and euphoria in their poetry as well as in their culture. But this was not limited to the Arab culture alone. Wine became the metaphorical symbol of warmth, energy, and euphoria in all cultures and literatures of the world. This type of poetry that started with the Arabs reached India by way of Iran. It is as if the Arab ship of poetry floating on rivers of wine reached India. This is how I would surmise it anyway. If you squeeze this poetry then you will get about ninety percent wine out from it – and that too in the form of revolutionary fervor beautifully expressed such as in this couplet:

Hundred-year-heavenly cycle was like one drinking session;
The world did change forever, by this one wonderful session!

If I continue this topic then this morning will stretch well into the evening. But the point is: what did the Arabs mean by wine? Well:

Wine is life-enhancing to the lucky hand holding the cup;
Lines turn to life-veins of the palm that holds the wine cup!

And don't ask what heights the Arab poetry had reached during that period? To the Arabs if the description was of wine; if the language was Arabic; and the

poet was of the period of the *Jaahiliyya* – then don't ask how one becomes completely intoxicated by just listening to that poetry! On the other hand, if you look at Islam, it is not a religion of weakness; or of helplessness; or of deprivation; or of poverty and hunger; or of hopelessness or depression. This is a *Deen* of power and authority; of splendor and glory; of dignity and pride; of dominion and sovereignty; of leadership and victory. The metaphor of wine serves to express these qualities of this *Deen*. Whenever the Quran uses the metaphor of heavenly wine it is a metaphor to describe these extraordinary qualities of this *Deen*; it is a metaphor to highlight its teaching, its system, and its truths and realities. In the words of Allama Iqbal: wine is a metaphor for pumping lifeblood into the dead body of the *Ummah* so that it is invigorated with life and energy in order to achieve power and authority; splendor and glory; and dignity and pride. The Quran is talking here of رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) – tightly sealed pure wine that provides energy and warmth, and intensity to carry out the pure message of *Tauhid*.

Pristine wine, the message of *Tauhid*; and the Quran, the Word of Allah

My dear friends, the Quran has used the word "طَهُورًا" (*Tahooran*) for its pristine message (described as pure wine). The Quran's system (its *Deen*) is pure and complete message of *Tauhid*. For the sake of understanding, we can take it metaphorically that Allah's message which is contained in words and pages of the Quran as the pure wine; and the Book which physically contains its pages and its words as the sealed the bottle. Allah's message is thus secured and protected; and He Himself has taken the responsibility to protect it. This is the رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) – pure wine that Allah has sealed with the seal of musk. Musk is highly expensive and has been used throughout history as a life-saving powerful drug used in various cardiac, mental and neurological disorders. Seal of musk therefore represents Islam's symbol of power and authority; its dignity and grace; and its domination and supremacy. By the way the word مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) is derived from خاتم (*Khaatam* or *Khaatim*) which has created an argument about whether it is to be pronounced as Khaat*a*m or Khaat*i*m. Some took this debate to another level altogether

saying it is of two types: one type is stamp which is used on official documents and the other type is a seal that seals something tightly. On top of this some go to the extent to claim that when the Prophet (PBUH) puts his stamp on someone's application for prophethood he becomes a prophet. But in the Quran it is clearly used in the sense of a seal not as a stamp. The real thing is that the Prophet (PBUH) is the seal of the chain of Prophets and there can be no further extension of this chain. When the Quran became مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) then the Prophet (PBUH) automatically became مَّخْتُومٍ (*Makhtum*). The Quran clarified رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*) even further after this metaphorical description of رَّحِيقٍ (*Raheeq* or wine) so that it may not be taken as physical wine.

Mixing كَافُور (*Kafoor* or camphor) in wine

Pure wine is a potent and powerful drink. Wine drinkers normally mix soda or some other thing into the wine. The Quran also mixes something into its wine in order to explain the unique attributes of its system. This is done in order to make sure that its system remains balanced. Quran's system is extremely powerful but it is also graceful. The Quran says that when its wine's intensity goes up then in order to maintain its balance and standard كَافُور (*Kafoor* or camphor) is added to it. Native physicians know that كَافُور (*Kafoor* or camphor) has tempering property. When they need to temper down the potency of something, they mix كَافُور (*Kafoor* or camphor) in it**.** In Arabic language the root meaning of its root (ك - ف - ر) is to suppress something; to cover up something. And that is what كفر (Kufr) does – it suppresses human dignity. So, كَافُور (*Kafoor* or camphor) does not remove the potency but only suppresses its intensity.

Mixing زَنجَبِيل (*Zanjabeel* or ginger) in wine

On the other hand, adding زَنجَبِيل (*Zanjabeel* or ginger) to the Quranic wine will increase its potency and power and bring it up to its normal intensity. The Quran wants to maintain balance in society: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (48:29) – the messenger of Allah and his companions are strong against the purveyors of injustice. This represents the potency and power of Islam. But رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) – they are merciful towards each other. This represents the

gentle, compassionate, and kind side of Islam. Then the Quran gives example of a balanced character from real life of its followers. It says: they bow down to sincerely accept the laws and duties from their Creator, the Almighty Allah; and stand up to carry out this responsibility with 100% trust and with full accord and happiness. This is the قیام (*Qiyam* or standing up); and immediately afterward is رکوع (*Ruk'u*) or bending down and سجود (*Sujud*) or bowing down. The intensity of power and authority needs tempering down in appropriate situations. It is all about creating balance individually and collectively. Life is not just about قیام (*Qiyam*) or standing up but it also needs: رکوع (*Ruk'u*) or bending down and سجود (*Sujud*) or bowing down. Whenever the Quran gives the metaphor of wine, رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*), that is what it means in terms of action: passion and intense action moderated by periods of reflection, deliberation, remembrance, and rejuvenation. What the Quran has said is very revealing: the entire point of man's character is that it should remain normal – extremes on either side in his personality are bad for his character. There should be something to stop man from either extreme and bring him to normalcy; and that is Allah's commandment does. Wherever there are exploitation and subjugation, people lose their strength and become weak, and feel suppressed; then they are given a shot of زَنجَبِيل, that is, they are taught Allah's commandment which gives them warmth and energy to become fit for life's struggles; and vice versa. Too much power leading to excess and extreme must be tempered by Allah's commandment which, in this case, is كَافُور. The characteristic of heavenly life in this world is that it should not have weakness as well as that it should not have arrogance of power. It is a life of balance. I always give examples from Iqbal. His fountain of knowledge sprung from the Quran. If we keep the Quran in front and view Iqbal's poetry in its light then things become very clear. In this context let us see how well Iqbal explains the situation we are discussing here:

Self, its potency, and its intensity; no pride of superiority there may be;
Even if so, then it is with sense of modesty, whatever pride there may be.

Did you notice what Iqbal has been able to convey here? What has been

called رَّحِيْقٍ (*Raheeq* or pure wine) is this teaching of dignity and power; grace and beauty. It is this holistic teaching of the system of *Deen*.

Allah has always started His message from human beings

My dear friends, Islam (the *Deen*) does not start its message from Allah but it does it from human beings. It says that human beings have been endowed with dignity. Any system of life that is in the way of human dignity; that is in the way of human values – is كفر (*Kufr*). The only way human dignity can remain established is when no human is under the obedience of other human beings; that no human is dependent on others. If that is the case, then does it mean that there will be anarchy; that there would be no rules and regulations or there would no discipline or control; that there would be no obedience of anyone at all? No, it won't be like that at all. There would be obedience but that obedience will solely be of the Creator of all, the Almighty Allah. The One who has created human beings – His obedience cannot be ignominy or disgraceful to human beings as He is the Sustainer and Nurturer of all human beings. If humans adopt the obedience of human beings then they fall from grace, they fall from their own humanity: اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ(95:5) – they fall into the lowest of low. If humans fall to this level then this wine of the Quran will lift them up to the dignified place they deserve. In the words of Iqbal:

Bring to me that same old wine and cup O Beloved;
That I may once again reclaim my place O Beloved!

The pristine wine of the Quran offers humans their rightful place. Whosoever falls from his place it lifts him and restores his place. This is the *Deen*; this is the goal of Islamic system – that is, to offer human his rightful place; and to get human dignity established in such a way that human being is no longer subservient and obedient to any human being except the exclusive obedience and subservience of Allah alone. This is the rightful place of humankind. This is what the wine of the Quran does. Again, Iqbal explains this very succinctly:

After making someone drunk, it is easy to push him into the pit;
To pull those who have fallen; that is the real tribute and bliss.

The Quranic wine pulls fallen souls

My dear friends, the Quran stops people from falling. That is why it says: يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (83:25) – They will be given a drink of pure wine whereon the seal [of God] will have been set. This seal is very special: خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) – pouring forth with a fragrance of musk. To that [wine of paradise], then, let all such aspire as [are willing to] aspire to things of high account [Asad]. There are these two words – فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ – in which is contained the essence of being human: his continued evolution and advancement. Life continues to move forward; and self-preservation is in its instinct. We can easily observe this at the animal level. Take for example a lowly ant. How much she struggles to save its life from any danger that comes its way. The instinct of self-preservation is in the character of human beings as well. Struggle is necessary for self-preservation. Life must overcome any challenges that come its way in order to preserve it. This is what we normally refer to as the law of the survival of the fittest – or to compete in the race of life in order to survive in the language of the theory of evolution. The entire teaching of the Quran is that in order to move forward life must struggle. If life stops struggling and becomes stationary at a place then the Quran calls it جَحِيم (*Jaheeem*), which means getting stuck at a barrier unable to cross and move forward.

The train of life and frequent stops on its forward journey

Those species that could not cross a barrier in their way became extinct or remained stuck at the same place in the chain of evolution. This is a very interesting topic of research. All the animals that exist today and were able to survive are the results of the incessant working of this evolutionary chain. Others, who could not, became extinct and vanished. And who knows how many of those that have survived so far will remain, or become extinct in future? But compared animal life that remains stuck in one place, or in other words, remains in جَحِيم (*Jaheeem*), human life moved ahead. The same process of evolution that brought life to this stage must continue further. But at this stage, two kinds of ideas about life came into being: One at the physical level –

Eat, drink, enjoy, procreate, and die. This is جَحِیم (*Jaheeem*), as life at this level keeps repeating the same cyclic order without any advancement. We have only one word دوزخ (*Dozakh* or Hell) in our language that is used as translation of all these different words of the Quran: جَحِیم (*Jaheeem*) and جہنّم (*Jahannam*) and سقر (*Saqr*). Is the Quran doing poetry that it uses one or the other of these words in order to maintain poetic rhythm? The Quran itself says that it is not poetry. Every word of the Quran is like a mountain and it has its own unique and precise meaning. So, the meaning of getting stuck or جَحِیم (*Jaheeem*) applies at the physical level because it keeps repeating at the same level without further advancement on the ladder of evolution. As opposed to this there is another concept of life that says that it is not just the life of this world; that life is to be lived as a struggle in this world for self-preservation, and self-advancement into the other world. One needs this physical struggle to advance to another level, not to be "as you were."

Light of the forehead in Paradise

Struggle is a prerequisite to move forward in physical life. All the resources required for this struggle are absolutely necessary to acquire. The Quran mentions good things of this world first: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (2:201) – Our Sustainer! Grant us good in this world and good in the Hereafter. If the good things of this world are not available then how can life move forward? It will be the end of it here itself. If preservation of the self is kept only at the level of this physical life; that the goal of life is the life of this world only – then this is جَحِیم (*Jaheeem*), this is the end, this is getting stuck. But if the goal is to move forward, to move ahead beyond the life of this world – then this next place will be called Heaven. In the forward movement of life even Heaven is not the final destination but only the next stage of life. The Quran says that the forehead of the people of heaven will light their way for keeping them moving forward under this light. This is what is meant by the forward movement in the various stages of evolution.

The difference between the physical wine and the Quranic wine

The Quran's system is bound to advance. The power and authority that is

needed for this advancement, comes from its wine, the رَّحِيقٍ (*Raheeq*) مَّخْتُومٍ (*Makhtum*). We feel ecstatic when we read the following verses: يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ (83:25) – They will be given a drink of pure wine whereon the seal of Allah will have been set. The seal is thus very special: خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ (83:26) – pouring forth with a fragrance of musk. What will be the purpose of drinking this Quranic wine? فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) – This will let all such aspire as are willing to aspire to things of high account. In these two words – فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ – is contained the essence of humanity; its continued evolution and advancement. This Quranic wine provides the strength and energy to struggle both individually and collectively to achieve the highest position of humanity: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) – the highest degree of superior status, the top position in the world. This topic has appeared in many places in the Quran. For example: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10) – the foremost will be foremost. Another place provides further explanation of this: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) – To any of you who choose to press forward, or to follow behind. In the Quran's system there is no question of stopping at a place. This is a continuous journey of moving forward.

Moving downward towards degradation

My dear friends, nothing stays at the same place. If it doesn't move ahead then it falls behind because it lacks the ability to struggle and is not able to keep up with the rest. This is an interesting scientific topic and I will digress if I get too much into details about it. Changes are always happening – so if there is no forward movement then one slips behind. It is like climbing a mountain. If one cannot keep up then one falls behind. What to say of the Quran my friends! لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) – To any of you who choose to press forward, or to follow behind. One can drink the Quranic wine to get rejuvenated and move forward – individually, collectively, and move forward in the history of humankind. This is race course. I have mentioned several times in these lectures when discussing الصَّلٰوةَ (*Salaat*) that – مُصَلّٰی (*Musllah*) is a horse in a race course that is number two just behind the number one horse. The Quran is very clear about it: whoever wants let him move forward and whoever wants

let him be left behind! The Quran gives complete freedom.

Wine according to cup size

Bigger your cup the greater will be the amount of your wine. Wine drinkers have come up with great poetry. This is a free invitation to all. There is no limit; there will be no question of budget deficit. The only question is how big a cup you bring. And then, use this shot of energy drink to move forward and move higher: فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26). The Quran has described this metaphorically as climbing a hill. What a beautiful metaphor indeed is this! A path that is straight and leads to higher and higher level! And then the Quran says: وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (83:27) – for it is composed of all that is most exalting [Asad]. تَسْنِيْمٍ (*Tasnim*) means waterfall coming from great height. I just remember all the waterfalls I had the misfortune to see in Kashmir! How beautiful it is to see these falls coming from the high up from the top of the mountains. And of course, I hear from people the captivating majesty of Niagara fall in Canada. So, by metaphorically using the example of تَسْنِيْمٍ (*Tasnim*), the Quran is emphasizing here the essence of its teaching: to take humanity to greater and greater heights. Then the Quran says: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (83:28) – A spring, from (the waters) whereof drink those Nearest to Allah [Yusuf Ali].

Difference between مقرّب (*Muqarrab* or closeness) and separateness

My dear friends, metaphorically speaking you can understand that those who drink this "wine" fall into the steps of Allah. This is only a metaphor or an example to explain this closeness to Allah. مقرّب (*Muqarrab*) means closeness but it cannot be physical closeness to Allah. Allah is not situated physically anywhere. The Quran says: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) – He is with you wherever you may be. So, physical closeness to Him is not a correct concept of God. One cannot be close to Him in terms physical distance. The closeness to Allah means closeness to His attributes – except of course those attributes that are infinite, as for example: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (57:3) – He is the First and the Last. But, by imbibing Allah's other attributes – attributes such as Sustainer, Provider, Nurturer, Knower etc. – in their character human beings can get closer to Him.

Imbibing Allah's attributes within human limitation

Allah's attributes are infinite. So, a human being can only imbibe them in

limited form because of his finite capacity. The more the attributes he imbibes into his character the more closer he will continue to get to Allah or, in the words of the Quran, he will become مقرّب (*Muqarrab*) of Allah. This is the same thing as getting the color of Allah or being in harmony with Allah's attributes.

Sufi's closeness to Allah

Sufis' claim to be closer to Allah has strange concept: Being hungry and weak; and having neither food nor clothe; nor a roof over their heads – this is their concept of being closer to God. Their logic is fantastic: neither God eats, nor do we eat; neither God has clothes, nor do we have clothes; neither God has a house, nor do we have a house: – so this is what being closer to God means to Sufis. What a beautiful poem sums up this deranged concept of Sufis:

At the dark misfortune of the mirror, I am surprised greatly;
It did not become Sun though it took you in its embrace fully.

What to say of this misfortune my friends! How proud they are at their bad fate, these Sufis? And they think they are closer to God? But what happened to imbibing God's attributes of power, authority, and grandeur? Well, these attributes disappeared from the mental horizon of the Sufis? But the Quran says: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۠ (2:138) – Our life takes its color from Allah! And who could give a better color to life than Allah. But the truth is everyone avoids dipping in this color because it *will* wipe out all the other colors that we have colored ourselves with. Getting the color of Allah actually means imbibing His attributes in our daily life. This is the meaning of getting closer to Allah: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (83:28) – A spring, from (the waters) whereof drink those Nearest to Allah [Yusuf Ali].

My dear friends, in this material rat race of life everyone is mad to surpass everyone else. As for the necessities of life these are limited. But greed has no limits. And if everyone is driven by that greed to surpass others – and most do – then the madness that we see in the world today is the result of that greed.

Greed drives humans away from a bright destination

Humans have the desire to get ahead and surpass others in material aspects, so says the Quran: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) – You are obsessed by greed

greed for more and more until you go down to your graves. But the Quran also says that this feeling drives humans away from the true and real goal of life because they become obsessed with surpassing each other in material possessions and material comforts. And in this rat race humans become blindsided from the real purpose of life. There is limit to physical necessities. But when humans become obsessed with the material aspects of life then their journey of greed accompanies them: حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ – until their grave.

The Quranic meaning of تکاثر (*Takaasur*) تنافس (*Tanaafus*)

Both verse (102:1) and verse (83:26) refer to human competition to surpass each other. But the verse (102:1) uses the word تکاثر (*Takaasur*) and the verse uses the word تنافس (*Tanaafus*). Now, look at the marvel of the Arabic language: تکاثر (*Takaasur*) is used for perceptible and physical things; things that are visible and concrete. In contrast to this, تنافس (*Tanaafus*) is used in relation human personality or human self. The Quran recognizes the human tendency to compete with each other and to surpass each other; the tendency to engage in the rat race of life. But the Quran teaches humans to race with each other in تنافس (*Tanaafus*) and not in تکاثر (*Takaasur*). It clearly tells that the result of racing in تکاثر (*Takaasur*) ends with the grave. But it tells that the result of racing in تنافس (*Tanaafus*) does not end with the grave but moves ahead; the material things and the physical body end with the grave no doubt but the human self – for whose forward movement so much was done – moves on carrying with it the result of all the work that was done for the تنافس (*Tanaafus*) – because the self does not die with death; because it is an continuous flowing never-ending river of life passing through the worldly desert and entering the lush garden of paradise and getting closer and closer to Allah: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (83:28) – A spring, from (the waters) whereof drink those Nearest to Allah [Yusuf Ali].

Fountain springing from deep inside heart

My dear friends, we know that Allah, the all-knowing, knows even the thoughts going on in our hearts. Here in verse (83:28) it refers to a spring. But a spring is something material that comes out of high hills of mountains. The

Quran says that this spring is not something that comes out of somewhere else but it is a spring that believers (*Momin*) bring out from deep inside the rocks of their own hearts. Again, in the words of Iqbal:

If you are among the alive, create a world of your own;
Life is hard rock, tear it, and create a river of your own.

What to say Iqbal my friends! His source is the Quran. That is why his vision is far high and thoughts are far deep and, at the same time, full of grace and subtleties.

The Quran has named the spring – which believers (*Momin*) bring out from deep inside the rocks of their hearts – سَلْسَبِيلً (*Salsabil*). That means it is not a stationary body of water but continuously flowing stream passing in front of every house calling up the residents: Here I am, take as much water as you need – and then it continues on and on and on… This is the spring which believers (*Momin*) bring forth from deep inside of their hearts. And they are the مُقَرَّبُونَ (*Muqarribun*) of Allah or closer to Him: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (83:28) – A spring, from (the waters) whereof drink those Nearest to Allah [Yusuf Ali].

Meaning of مجرم (*Mujrim*) in the light of the Quran

The Quran says that in contrast to مُقَرَّبُونَ (*Muqarribun*) there are the مجرمون (*Mujrimun*). According to its root meaning جرم (*Jurm*) is to pluck the fruits of someone else's tree. But nowadays these مجرمون (*Mujrimun*) are not only not called as such but they roam around in public as very civilized folks. The Quran says about them: اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ(83:29) – Lo! The guilty used to laugh at those who believed [Pickthall]. What were the believers saying that the مجرمون (*Mujrimun*) used to make fun of them? What were the believers doing that these مجرمون (*Mujrimun*) used to laugh at them? They were saying: work hard to the best of your abilities and keep only that much which fulfils your basic needs and give you surplus to others. The مجرمون (*Mujrimun*) used to mock at them calling them mad. They even called the Prophet (PBUH) مجنون (*Majnoon*) or mad. Why wouldn't they? Because, according them, he did not care about his own profit or loss? Well, even now, such people are called mad because "they don't care about their own profit or loss." Keep everything to yourself, only then you are clever according to them.

On the other hand, you keep the minimum possible for yourself and give the rest to others, then you are mad – and they laugh at this and make fun of those who say this; if not in front of them, then behind their backs. What a dramatic scene the Quran presents?! Someone invested his small capital and he tried to run his business honestly. But then he lost everything due to his honesty and others laugh at him; make fun of him. Those who have amassed wealth by hook or by crook and are laughing at him and making fun of him – the Quran calls them مجرمون (*Mujrimun*) or criminals. These are the ones who not only keep the fruits of their own trees but steal the fruits of other people's trees. So, why wouldn't they laugh at those who keep minimum amount of fruits of their own trees and give the rest to others? اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ (83:29) – Lo! The guilty used to laugh at those who believed [Pickthall]. وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (83:29) – and whenever they pass by them, they wink at one another derisively [Asad]. The Quran paints a dramatic picture here: They look at each with amorous eyes while making fun of the believers! وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۚ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (83:31-32) – and whenever they return to people of their own kind, they return full of jests; and whenever they see those who believe, they say, "Behold, these [people] have indeed gone astray!" [Asad]. They proclaim arrogantly: these are the people who have gone mad! Well, they can say whatever they want because:

You can name intellect as madness, and madness as intellect;
You can do whatever your handsome handicraft can construct!

Result of intellect and the fruit of madness

My dear friends, who cares to pay attention to what is the limitation of intellect and what is called true madness? What we normally call madness is in reality the intellect. The Quran – and in its light Iqbal – have differentiated between two types of intellect: the intellect that sees only its benefit; and the intellect that sees the benefit of all humankind. This is the difference between teaching of the Quran – the intellect that sees the benefit of all humankind – and the teaching of secularism and the teaching of the kind of Islam that is prevailing among us – the intellect that sees only its benefit.

My dear friends, the Quran says to believers that let them keep telling all

these things; let them mock and make fun. وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (83:33) – You, believers, have not been sent as guardians over them. The Quran tells believers to leave them alone; that you have not been appointed dictators over them that you must force them to believe; or to keep account of their wherewithal and their activity. Because: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۟ (18:29) – And say: "The truth has now come from your Sustainer: let, then, him who wills, believe in it, and let him who wills, reject it."

Mt dear friends, next the Quran tells that a period will come when believers will laugh at them. In the initial stages of the revolutionary program unbelievers have only a surface view of the believers; and the unbelievers think that the believers are a group of mad people; that they don't care about their own benefit or loss; and that is why the unbelievers laugh at the believers. But the Quran says: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (83:34) – But on this Day the Believers will laugh at the Unbelievers. When this program will reach its final goal then these believers will laugh at those used to deny the Our divine law of sustenance. At that time the believers will be sitting on the throne of power and authority and watching those who used to make fun of them: عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ (83:35) – Sitting on thrones of dignity and power they will command a sight over all things. Why would the unbelievers be facing such a calamitous end? Because what goes around comes around? Because one reaps what one sows? هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (83:36) – Will not the Unbelievers have been paid back for what they did? [Yusuf Ali]. This calamitous state they are in is the result of their own actions. Heaven and Hell is compiled from the result of one's own actions.

My dear friends, surah *Al-Mutaffifin* (سورة المطففين) ends here. In the next lecture we will take up Surah الانشقاق (Al-*Inshiqaaq*).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.69
ISSUE
7

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید پر ہدیہ تبرک قبول فرمایئے

تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ ضابطۂ حق وصداقت آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے لیکن وہ اتنا سمجھ لے کہ ان قوانین سے انکار کر کے دوسری راہیں اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی کا وہ عذاب ہے جو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جب وہ اس عذاب کی تلخی اور شدت کے خلاف فریاد کریں گے تو اس مصیبت کو کم کرنے والی کوئی چیز انہیں نصیب نہ ہو گی۔ بلکہ وہی سامان جو مساعد حالات میں، ممدِ حیات ہوتا ہے، ان کے لیے وجہ ہلاکت بن جائے گا۔ وہی سونا چاندی جس کے بل بوتے پر یہ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے یوں سمجھئے کہ اسے پگھلا کر ان کے حلق میں انڈیلا جائے گا۔ (9:34-35) کس قدر ہلاکت انگیز ہو گا یہ تلخابہ اور کس قدر تکلیف دہ ثابت ہو گا وہ سہارا جسے وہ اپنے لیے وجہ آسائش سمجھا کرتے تھے؟ (18:29)

علامہ پرویزؒ کے مفہوم القرآن (جلد دوم، سورۃ الکہف:29) سے اقتباس